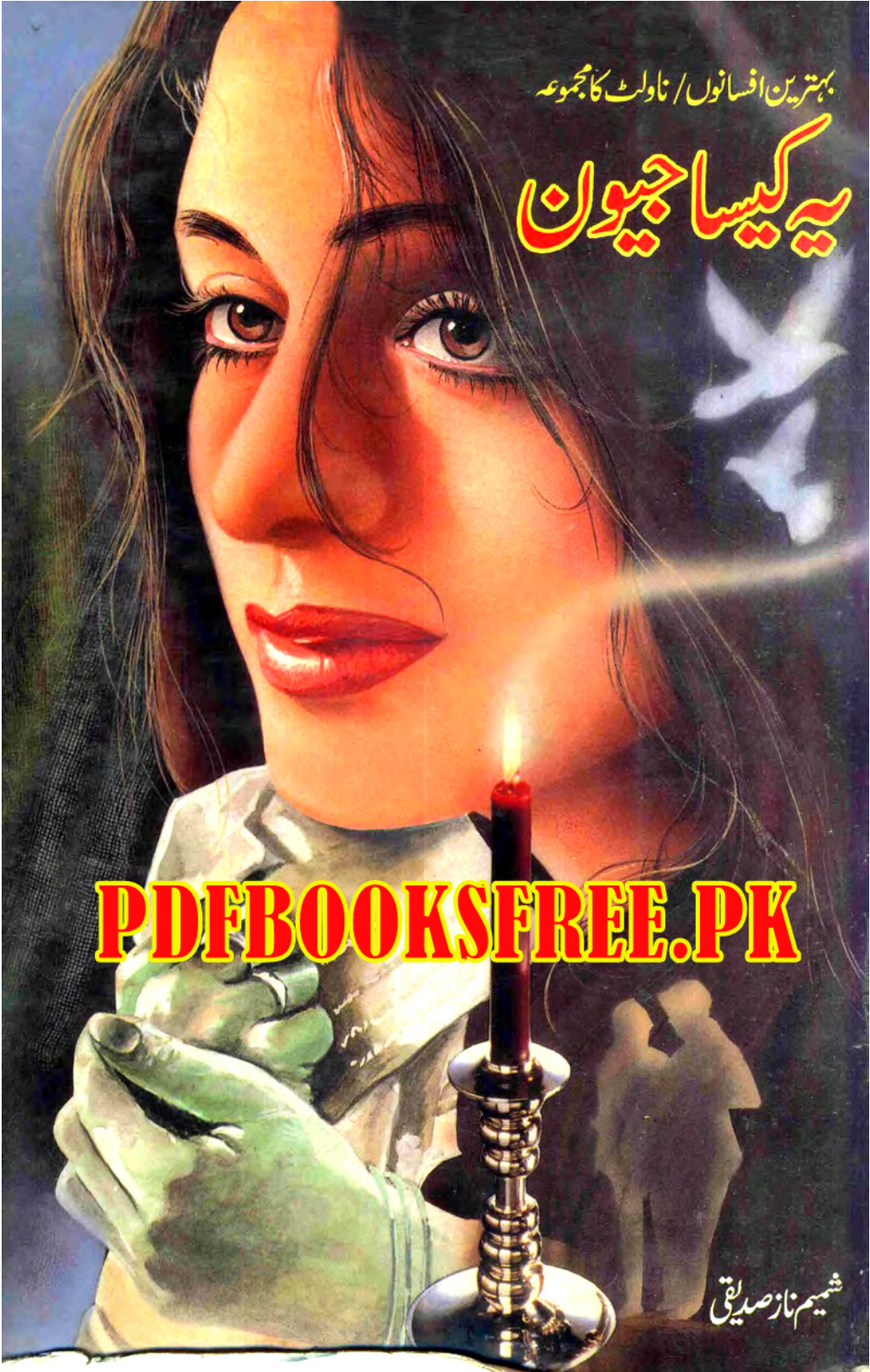
بہترین افسانوں / ناولٹ کا مجموعہ
یہ کیسا جیون
PDFBOOKSFREE.PK
شمیم ناز صدیقی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

پیش لفظ

میری تحریر کو پڑھنے والے قارئین میرے نام سے اچھی طرح واقف ہیں۔ 27 مئی کے تپتے ہوئے مہینے میں روشنیوں کے شہر کراچی میں آنکھ کھولی۔ چار بھائی بہنوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ تعلیم صرف انٹر تک ہی حاصل کی، برج جوزا کی تمام خوبیاں اور خامیاں مجھ میں پائی جاتی ہیں۔

اپنی پہلی کتاب ''یہ کیسا جیون'' کی اشاعت کی کامیابی پر اپنے اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے کامیابی سے ہمکنار کیا، اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے بعد ان سب کی ممنون ہوں جنہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ ایڈیٹر پاکیزہ انجم انصار صاحبہ نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا گو کہ میں نے ان کے ماہنامے میں کافی تاخیر سے لکھا مگر تین سال سے مسلسل پاکیزہ ایوارڈ حاصل کر کے نمایاں پہچان پاکیزہ سے بنائی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''یہ کیسا جیون'' کی اشاعت کا کریڈٹ بھی انجم باجی کو جاتا ہے۔ انہوں نے کتابیات پبلی کیشنز کی مالک عنبرین اعجاز صاحبہ سے رابطہ کرایا، عنبرین اعجاز نے بھرپور تعاون کیا۔

ایڈیٹر ماہنامہ آنچل فرحت آرا صاحبہ اور دوشیزہ کی ایڈیٹر فریدہ مسرور صاحبہ، پاکیزہ کی ایڈیٹر انجم انصار صاحبہ ان سب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری کتاب ''یہ کیسا جیون'' کے افسانوں اور ناول وغیرہ پر تاثرات لکھے۔ آپ سب کی محبت اور خلوص کا بے حد شکریہ۔

میری کتاب ''یہ کیسا جیون'' ایک ایسے شخص کے تاثرات سے محروم رہ گئی جس نے مجھے آگے بڑھنے میں بہت حوصلہ افزائی کی، جنہوں نے میری ایک کہانی ''غم کا دریا پار کیا'' کو منتخب کر کے انگریزی میں ترجمہ کرایا اور پھر مجھے فون پر مبارکباد دی کہ میری کہانی کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اور فلاں میگزین میں وہ کہانی لگی ہے۔ ہاں وہ عظیم شخصیت ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے بانی انکل سہام مرزا ہی ہیں جنہوں نے اپنی علالت کے دوران یہ وعدہ کیا کہ وہ میری کتاب پر اپنے تاثرات لکھیں گے مگر موت نے انہیں مہلت نہ دی اور چند دنوں بعد ہی وہ انتقال کر گئے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ آمین۔

اپنے بارے میں کچھ بتاتی چلوں کہ لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ مگر کامیابی کے لئے بہت جدوجہد کی، شوق اور جستجو نے تخلیقی صلاحیت میں کامیاب کیا۔ لکھنے کی ابتدا امن اخبار سے شروع کی، شروع میں ابا جی نے لکھنے کی مخالفت کی مگر پھر میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میری تحریروں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ان کی نظر سے صرف میرا ایک مضمون ''سفاش'' گزرا تھا جسے پہلا انعام بھی ملا تھا۔ جب تک بڑے ماہناموں میں لکھنے کے مقام تک آئی اس وقت تک ابا جی رخت سفر باندھ چکے تھے اور آج جب میری پہلی کتاب ''یہ کیسا جیون'' شائع ہو رہی ہے تو امی بھی دنیا سے کوچ کر چکی ہیں جو نہ صرف میری تحریر کو شوق سے پڑھتی تھیں بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتی تھیں اور کبھی کبھی بھرپور تنقید کرتی تھیں۔ میں نے اس کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کیا ہے وہ مجھے ہر وقت پکارا کرتی تھیں خاص کر بیماری کے دوران۔ میرے ذہن میں ان کی آواز کی بازگشت گونجتی ہے۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد میری نظر سے ایک شاعرہ کی نظم گزری اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ نظم میرے دلی جذبات کی عکاسی کر رہی ہے۔ اکثر میں اس نظم کو دہراتی رہتی ہوں ڈیڑھ برس گزر گیا ہے لیکن آج بھی یہ نظم میرے ذہن کے کینوس پر محفوظ ہے۔

ماں

ماں ایسا چھتنار شجر ہے
جی کرتا ہے اتر کر جاؤں
جس کا سایہ گھور اندھیرا
اس کی کوکھ میں بھر بھر جاؤں
جس کا موسم صرف سویرا
وہ جی جائے میں مر جاؤں
جس کی شاخیں چین بسیرا
لیکن ماں میری پیاری ماں
جس کی چھاؤں سکھ کا گاؤں
تجھے کہاں سے لاؤں

میں نے اپنی کتاب ''یہ کیسا جیون'' میں اپنے وہ خاص ناولٹ اور افسانے شامل کئے ہیں جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا۔ مجھے ذاتی طور پر اپنا افسانہ ''یہ کیسا جیون'' بے پناہ پسند ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ قارئین نے اسے بہت سراہا۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بس یہی سوچ کر اپنی کتاب کی اشاعت کی جلدی کی ہے۔ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔

''یہ کیسا جیون'' کی کامیابی کے بعد انشاءاللہ میری دوسری کتاب ''وفا کے دشت میں'' جلد ہی آئے گی۔

آپ کی محبتوں اور خلوص کی طلب گار

شمیم ناز صدیقی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میری نظر میں

افسانہ بے حد منہمک اور مبہوت کر دینے والی صنف ادب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے ہر دور میں ''اِن'' رہے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا کے سینکڑوں چینلز بھی اس صنف ادب کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔

شمیم ناز صدیقی کو افسانہ نگاری کے میدان میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا، مگر افسانہ نگار خواتین کی نئی کھیپ میں ان کا نام جانا پہچانا ضرور ہے۔

سیدھی سادی سی کہانیاں، سیدھے سادے انداز میں لکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ شمیم ناز کے لئے ہے، یہ سب کہانیاں، آج ہی کی کہانیاں ہیں۔

شمیم ناز کا یہ پہلا افسانوں کا مجموعہ، گھریلو کہانیوں کا ہی مجموعہ ہے۔ کہیں طوالت زیادہ ہے تو کہیں تشنگی نظر آتی ہے، جو زندگی کی ہی تفسیر ہے کہ ہمیں کہیں محبتیں نظر آتی ہیں تو کہیں نفرتیں۔ معاشرتی طبقات کی کشمکش، محبتوں کی روشنی، چاہتوں کی نرمی اور جذبوں کی گرمی ان کے افسانوں میں نمایاں ہے۔ گو موضوعات کے گونا گوں تیور اور تیکنکی رمز اس میں نظر نہیں آتے، مگر سچائی سے کی گئی منظر کشی اتنی بھلی لگتی ہے کہ جگہ جگہ کہانیوں میں موتی ٹانکتی اور پھول پینٹ کرتی نظر آتی ہے۔

انجم انصار

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ کراچی

فہرست

نمبر شمار	افسانے/ناولٹ	صفحہ نمبر
1	یہ کیسا جیون	9
2	پھر اس انداز سے بہار آئی	19
3	تمہیں جیت کر ہارے	37
4	تم حاصل زیست نہ تھے	49
5	رازِ پنہاں	75
6	محبت میں کوئی موسم نہیں	83
7	وفا کے موڑ پر	93
8	نیا جوڑا	115
9	غم کا دریا پار کیا	121
10	خزاں کی رت سنہری ہے	130
11	بھرم	151
12	محافظ	159
13	المیہ	171

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہ کیسا جیون

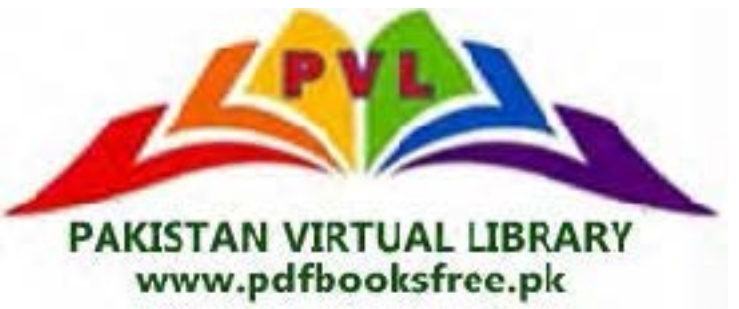

چاند کا ڈولا ہو اور بجلی کا باجا ہو
ڈولے میں رانی ہو اور گھوڑے پر راجا ہو
پیار کے رستے ہوں اور پھول برستے ہوں

مسز جمال کی پُر سوز آواز کے سحر میں ہم سب کھوئے ہوئے تھے۔ آفس کے لنچ بریک میں وہ عمارہ کی فرمائش پر اکثر یہی گیت گنگناتی تھیں۔ ہر دم مسکرانے اور کھلکھلانے والی مسز جمال کے چہرے پر کرب کی لکیریں نمایاں ہو جاتیں اور وہ گیت ادھورا چھوڑ دیتی تھیں "بھئی عمارہ مجھے یہ گیت اتنا ہی آتا ہے۔"

مسز جمال کو ہمارے آفس میں آئے ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا تھا مگر انہوں نے اپنے اخلاق اور خلوص سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ پینتیس، چھتیس سالہ مسز جمال کے چہرے پر نو عمر لڑکیوں جیسی شادابی تھی۔ مجھے وہ پہلے ہی دن بہت اچھی لگی تھیں اور میرا دل اندر ہی اندر ان کی طرف جھکتا چلا گیا تھا مگر اس دن مجھے بڑا زبردست دھچکا لگا تھا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مسز جمال نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ ان کے تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر مجھے یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ ابھی تک تنہا ہیں ورنہ اس عمر کی خاتون کے لیے اس بات کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی میرے دل کو قرار نہیں آیا تھا۔

اکثر لنچ بریک میں وہ اپنے تینوں بچوں کی شرارتوں کا ذکر کرتی رہتی تھیں "میرے تینوں بچوں میں عرفی بہت سنجیدہ اور ذہین ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری کی باتیں کرتا ہے۔ آیا کو بھی تنگ نہیں کرتا مگر اجیہ اور فیضان بہت شریر ہیں۔ آیا بے چاری کو سارا دن نچا کے رکھتے ہیں۔"

"اور فیضان کے پاپا کیسے ہیں؟" میں نے جانے کس لیے یہ سوال کیا۔ یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں میں دیپ سے روشن ہو گئے۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"جمال کے حد سے زیادہ لاڈ نے ہی تو دونوں بچوں کو بگاڑا ہے۔ آیا کو اتنا تنگ کرتے ہیں کہ ہر مہینے مجھے نئی آیا تلاش کرنی پڑتی ہے۔ کوئی رکنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ جمال آفس چلے جاتے ہیں۔ میں ادھر آجاتی ہوں۔ سارے دن کی ذمے داری آیا پر ہوتی ہے۔ اس بار تو معجزہ ہوا ہے کہ تین مہینے سے یہ آیا ٹکی ہوئی ہے۔ بچوں کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے اس سے۔"

مسز جمال کے ساتھ باتوں کا سلسلہ اس طرح چل نکلا کہ لنچ کا ایک گھنٹا پلک جھپکتے گزر جاتا اور ہم دوبارہ اپنی اپنی سیٹوں پر چلے جاتے۔

ہم لوگ صرف لنچ بریک ہی میں بات چیت کرپاتے تھے۔ آفس ٹائم میں سب اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ مسز جمال کا زیادہ وقت ایم ڈی کے روم میں ہی گزرتا تھا۔ کوئی نہ کوئی گیسٹ آیا رہتا اور مسز جمال وہیں مصروف رہتیں۔

ایم ڈی صاحب بڑے بااصول اور نیک آدمی تھے۔ ان کا بزنس میں ایک مقام تھا مگر وہ بہت سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ جب اپنے اسٹاف کے ساتھ بات چیت کرتے تو محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ایم ڈی ہیں۔ مسز جمال بھی ایم ڈی صاحب کی بہت تعریف کرتی رہتی تھیں۔

مسز جمال، وقار صاحب، عمارہ اور فرحت یہ سب میرے کولیگ تھے اور ہم سب لنچ روم میں ایک ساتھ لنچ کرتے تھے۔ بالکل گھر جیسا ماحول بن گیا تھا۔ مسز جمال کھانے بنانے میں ماہر تھیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی نئی ڈش بنا کر لاتیں۔

انہیں دیکھ کر میرے دل میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ میں سوچتا آخر ہم ایسی چیز کی تمنا کیوں کرتے ہیں جو ہماری دسترس، ہماری پہنچ سے بہت دور ہوتی ہے۔

میرے بالوں میں چاندی نمایاں ہونے لگی تھی مگر میں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ شاید مجھے مسز جمال جیسی کسی دلکش خاتون کی تلاش تھی۔ لمبے سلکی بال، گلابی رنگت، پُرکشش بڑی بڑی آنکھیں، دل فریب مسکراہٹ، دل میں اتر جانے والا شیریں لہجہ!

جب ایک بار ہنستے ہوئے انہوں نے اپنی عمر بتائی تو مجھے کیا کسی کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔ چالیس کی تو وہ لگتی ہی نہیں تھیں جبکہ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا "رمیز، میں تو چالیس کا ہندسہ بھی کراس کرچکی ہوں۔ یعنی ابھی ایک ماہ قبل میری چالیسویں سالگرہ تھی۔"

"ارے تو مسز جمال آپ بالکل صحیح عمر کیوں بتاتی ہیں جب کہ کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔" عمارہ نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

وہ مسکرا کر بولیں "بھئی اب مجھے عمر چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں تم لوگ چھپاؤ تو ایک بات بھی ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں مسز جمال! ہماری ایسی قسمت کہاں! ہم اگر پچیس کہیں تو لوگ ہمیں تیس کا سمجھنے لگتے ہیں کہ ضرور گھٹا کر بتائی ہوگی۔ ایک آپ ہیں کہ چالیس سے اوپر کا بتا رہی ہیں اور لوگوں کو یقین نہیں آرہا ہے۔" عمارہ نے شرارت سے میری طرف دیکھا اور اٹھ کر اپنی سیٹ پر چلی گئی۔

مسز جمال نے عمارہ کے لہجے کی کاٹ اور طنز کو محسوس کرلیا تھا۔ سب لوگ اٹھ کر اپنے اپنے روم کی طرف جاچکے تھے۔ میں اور وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "رمیز ایک بات پوچھوں اگر مائنڈ نہ کرو تو؟"

"ارے آپ جو پوچھنا چاہتی ہیں پوچھیں مسز جمال۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں "تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"بس خیال ہی نہیں آیا۔ دھیان ہی نہیں دیا کہ گھر بھی بسانا ہے، وقت گزرتا چلا گیا۔ ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ ہم تینوں کو چچا چچی نے پالا۔ وہ بے اولاد تھے۔ بہنوں کی شادی کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ چچی نے کئی بار کوشش کی مگر مجھے چچی کی بتائی ہوئی کوئی لڑکی پسند نہیں آئی یا یوں سمجھ لیں کہ میں شادی کے بارے میں سنجیدہ ہی نہیں تھا۔"

"بھلا کیوں، کوئی تو وجہ ہوگی۔ لگتا ہے کسی آئیڈیل وغیرہ کا چکر تھا تمہارے ذہن میں۔" مسز جمال نے فوراً ہی کریدنا شروع کردیا۔

"میرے خیال میں میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مسز جمال دیر تک ہنستی رہیں۔ اتنا ہنسیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیرنے لگی۔

میں بری طرح چونک گیا "آپ خوش ہیں نا جمال کے ساتھ؟" میں نے اچانک ہی سوال کرڈالا تھا۔

"بھئی خوش نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جمال ایک آئیڈیل شوہر ہیں اور پھر ہم دونوں کی لو میرج ہے۔ رمیز حسن، میں بھی بہت عرصہ آئیڈیل کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہوں مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے میرا آئیڈیل، میرے خوابوں کی تعبیر جمال کی صورت میں مل گئی۔"

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں چہکتے ہوئے کہا تو میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر رہ گئی۔

انسان بھی کبھی کبھی بہت خودغرض اور کمینہ ہوجاتا ہے۔ میرے دل کے اندر بھی یہ موہوم سا خدشہ تھا کہ شاید مسز جمال اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہ ہوں اور..... اور..... مگر ان کا شوہر، صرف شوہر نہیں ہے، محبوب بھی ہے جبھی تو جمال کے ذکر پر ان کے چہرے پر رنگ سے بکھر جاتے ہیں۔

میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

ایک شام واپسی پر میں اور وہ ساتھ ساتھ اسٹاپ کی طرف آرہے تھے۔ وہ مستقل بول رہی تھیں اور میں خاموشی سے سنتا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ تبھی وہ اچانک بولیں "رمیز حسن! تمہیں عمارہ کیسی لگتی ہے؟"

سوال اتنا اچانک تھا کہ میں حیران رہ گیا۔

"مطلب تو بالکل صاف ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش نہ کرو تو اور بات ہے۔" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا پھر کچھ دیر رک کر بولیں "تمہیں پتا ہے، عمارہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھتی ہے، صرف تمہاری باتیں کرتی ہے۔ کل رات دیر تک فون پر بھی تمہارے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اچھی لڑکی ہے، تم اس سے شادی کرلو۔" مسز جمال نے اس طرح کہا جیسے وہ مجھے حکم دے رہی ہوں کہ میں عمارہ سے شادی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کرلوں۔

نہ جانے مسز جمال کے لہجے میں کیا تھا کہ میں کچھ دیر تو خاموش رہا' پھر میں نے حامی بھرتے ہوئے کہا "مگر آپ کو بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔ میری ایک شرط ہے۔"

"کہو کیا چاہتے ہو' کیسی شرط؟" انہوں نے بڑے جوش میں کہا۔

"میں اس گانے کی کہانی جاننا چاہتا ہوں جو آپ اکثر سناتی ہیں۔"

میری بات سن کر وہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئیں۔

"سوری رمیز' یہ گنگنانے کی عادت تو یوں پڑ گئی ہے کہ میری بیٹی اجیہ کہانی سنے بغیر نہیں سوتی۔ تب میں اسے یہ گیت سنا دیتی ہوں۔ بس یہ گیت میری زبان پر اتنا چڑھ گیا ہے کہ اکثر گنگناتی رہتی ہوں۔ تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا؟"

انہوں نے کچھ اس طرح شکایتی لہجے میں کہا کہ میں خود ہی خاموش بلکہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"رمیز میرا خیال ہے شادی اسی سے کرنی چاہیے جو تمہیں چاہتا ہو۔ کسی کی محبت کی قدر کرنا چاہیے۔"

"اور' اور اگر دل کسی اور کی طرف مائل ہو تب؟" نہ جانے کیسے میرے منہ سے یہ جملہ پھسل گیا تھا۔

مسز جمال نے چونک کر میری طرف دیکھا "کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے رمیز کہ ہمارا دل جس کی طرف مائل ہوتا ہے' وہ ہماری دسترس سے بہت دور ہوتا ہے اور جو ہماری دسترس میں ہوتا ہے اسے ہم خود نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی محبت کو ہم بڑی بے دردی سے ٹھکرا دیتے ہیں اور یہی محبت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

اسی لمحے مسز جمال کی کوچ آ گئی اور وہ مجھے خدا حافظ کہتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

مسز جمال میرے حواس پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ میں رات گئے تک بستر پر لیٹا انہی کے بارے میں سوچا کرتا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ دھیرے سے میری آنکھوں کے سامنے آ جاتیں۔

ایک دن مسز جمال نے بتایا کہ ان کے میاں جمال عن قریب امریکا روانہ ہونے والے ہیں۔ مسز جمال بہت خوش تھیں' یہ سب بتاتے ہوئے چہک رہی تھیں۔ جمال نے بڑی جدوجہد کی ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔ جمال کے منع کرنے کے باوجود میں نے جاب کی تاکہ ان کی تعلیم کے دوران میں کچھ میں بھی تو ان کا ہاتھ بٹا سکوں۔ اسی خوشی میں' میں تم سب کو ایک زبردست ٹریٹ دینا چاہتی ہوں۔" انہوں نے عمارہ اور فرحت وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کب دے رہی ہیں؟" عمارہ نے فوراً ہی چہکتے ہوئے پوچھا۔

"اگلا اتوار رکھ لیتے ہیں۔"

"کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ ٹریٹ ہونا چاہیے۔" فرحت بولی۔

"نہیں میرے اپنے گھر پر اس لیے کہ میں رات کو بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔"

"اور اس دن جمال صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" وقار صاحب بولے۔

انہی باتوں میں لنچ کا وقت ختم ہو گیا اور ہم اپنی اپنی سیٹوں پر آ گئے۔ ان دنوں عمارہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے مسز جمال نے اس سے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ہر وقت کھلی کھلی نظر آنے لگی تھی مگر نہ جانے مجھے کیوں اسے خوش دیکھ کر کوفت ہونے لگتی۔ کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ بنانے میں ناکام رہا تھا۔ جہاں مسز جمال کا بسیرا ہو وہاں کسی کے قدم رکھنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

ان دنوں مجھ پر مایوسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ جمال اگر امریکا میں سیٹ ہو گئے تو کچھ عرصہ بعد مسز جمال بھی چلی جائیں گی۔ مجھے محبت ہوئی بھی تو ایک ایسی عورت سے جو کسی اور کے ساتھ بہت خوش و خرم تھی مگر میں اپنی اس جنونی محبت کا ذکر کسی سے بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میں اپنے دل کو بہت سمجھاتا' بہلاتا مگر دل کسی ضدی بچے کی طرح ایک ایسے کھلونے کی طلب کر رہا تھا جو میری پہنچ سے بہت دور تھا۔ میں نے اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

دعوت والے دن میں بڑی ہمت کر کے اٹھا اور تیار ہو کر ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک خوب صورت بنگلا تھا جس کے چھوٹے سے لان میں قطار سے گلاب اور موتیا کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ رات کی رانی کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ میں نے گیٹ کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ مسز جمال میرے استقبال کے لیے آ گئیں۔

"رمیز آج تو تم لیٹ ہو گئے۔ سب آ چکے ہیں۔"

مسز جمال اپنی سلکی ساڑی کا آنچل سنبھالتی ہوئی آئیں۔ میں ہولے سے مسکرا دیا اور ان کی رہنمائی میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ گھر بہت خوب صورتی اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ملحق ڈائننگ روم تھا۔ خوب صورت لمبی میز پر برتن ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اوپری منزل سے بچوں کے بولنے کی آوازیں مستقل آ رہی تھیں۔ میری نظریں جمال کو تلاش کر رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے تھوڑی دیر میں کھانا شروع کر دیا جائے۔ جمال تو ابھی تک لوٹے نہیں ہیں۔ میں انہی کا انتظار کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ ہی دیر بعد آ جائیں۔"

"بھئی جمال صاحب کو تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔ یہ ٹریٹ انہی کی کامیابی کی خوشی میں تو دی گئی ہے۔" وقار صاحب نے کہا۔

"اصل میں ان کے جانے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ آج تو ان کا پورا پروگرام تھا گھر پر ہی رہنے کا۔ انہیں خود آپ سب سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے مگر شام کو ایک ضروری کال آ گئی' ایک گھنٹے کا کہہ کر گئے تھے' ابھی تک نہیں آئے۔ اب تو ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔ آپ لوگ کھانے سے فارغ ہو لیں تو میں اپنے تینوں بچوں سے ملواؤں گی۔ اتنے شریر ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔"

"وہ تو ہمیں گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ شور ہنگامے کی آوازیں مسلسل آ رہی ہیں۔ آپ نیچے بلا لیں انہیں۔" میں نے کہا۔

"ارے رمیز' وہ دنگا فساد کریں گے کہ اللہ کی پناہ! وہ تو سارے لونگ روم کو الٹ پلٹ کر دیں گے۔ آج تو میں انہیں اوپر ہی رکھوں گی۔" مسز جمال کہتی ہوئی ہم سب کو ڈائننگ ٹیبل پر لے آئیں۔

لذیذ کھانوں کی خوشبو نے ہم سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"یہ سب آپ نے اکیلے بنایا ہے؟" عمارہ نے پوچھا۔

"جمال کو باہر کے کھانے بالکل پسند نہیں۔" مسز جمال نے کہا "اس لیے دعوت کے موقع پر بھی تمام کھانے میں خود بناتی ہوں۔"

"آپ کے شریف بچے آپ کو اتنا کچھ کرنے دیتے ہیں۔" فرحت نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑی بہت سختی تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ آفس سے آکر بھی میں کھانا خود ہی بناتی ہوں۔ جمال کو کھانا میرے ہاتھ کا ہی پسند ہے اس لیے یہ ذمے داری تو مجھی کو پوری کرنی پڑتی ہے۔"

مسز جمال میزبانی کرنے کے علاوہ ہمارے ساتھ کھانے میں بھی شریک تھیں۔

ٹرن' ٹرن تبھی فون کی بیل پر باتوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ سوری کہتے ہوئے اٹھیں اور فون کی طرف بڑھ گئیں۔

میں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ جمال ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ گھر میں ایک سناٹا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اب بچوں کی آوازیں بھی نہیں آرہی تھیں۔ میں اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مسز جمال فون سن کر ادھر ہی آگئیں۔

"جمال کا فون تھا۔ کہہ رہے تھے' میری طرف سے اپنے کولیگز سے معذرت کرلینا۔ میں ایک گھنٹے بعد گھر پہنچوں گا۔"

"کوئی بات نہیں مسز جمال پھر کبھی سہی۔" وقار صاحب نے فوراً ہی کہا۔

"ایک منٹ' ذرا میں بچوں کو لے کر آتی ہوں۔ خلافِ معمول بڑی خاموشی چھا گئی ہے۔" وہ کہتی ہوئی زینے کی طرف چلی گئیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اکیلی واپس آگئیں۔

"مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سو چکے ہیں۔ صبح اجیہ اور عرفی کو اسکول جانا ہوتا ہے نا۔ آیا کوشش کرتی ہے کہ آٹھ بجے ہی سو جائیں۔" مسز جمال صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں "جب تک یہ بچے جاگتے رہتے ہیں' گھر میں رونق سی لگی رہتی ہے اور سوتے ہیں تو ایک دم سناٹا سا چھا جاتا ہے۔" وہ بڑی روانی سے بول رہی تھیں "اگلے ماہ اجیہ کی برتھ ڈے آرہی ہے۔ اس پر اپنے شیطان بچوں سے ضرور ملواؤں گی۔ پہلے میرا خیال تھا یہ ٹریٹ اسی دن دوں گی مگر پھر میں نے سوچا کہ اجیہ کی برتھ ڈے تک تو جمال امریکا جا چکے ہوں گے اس لیے ہم دونوں نے سوچا ٹریٹ پہلے دے دی جائے۔"

"مگر جمال بھائی تو پھر بھی غیر حاضر ہیں۔" عمارہ نے برجستہ کہا تو وہ کچھ خجل سی ہو گئیں۔

"میں انہیں آفس لاکر ضرور ملواؤں گی۔ جمال کو بھی تم سب سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے عمارہ سے کہا۔ وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔

○☆○

میں اندر ہی اندر یک طرفہ محبت کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک شادی شدہ

عورت ہے اور مجھے اس کے بارے میں اس طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر سچ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس بات کا یقین مجھے ہو چلا تھا کہ محبت ذات پات' اونچ نیچ اور عمر کا فرق کچھ نہیں دیکھتی' میرے دل میں مسز جمال کے لیے جو کونپل پھوٹی تھی' وہ رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ محبت کی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی تھیں۔

وہ موسمِ سرما کی سرد سی شام تھی۔ میرا آج کا سارا دن اداس گزرا تھا۔ آج مسز جمال نہیں آئی تھیں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ہمارے آفس میں آئے ہوئے انہیں پورا سال ہو رہا تھا اور اتنے عرصے میں وہ آج پہلی بار غیر حاضر تھیں۔ جمال امریکا گئے تھے تو اس دن بھی انہوں نے چھٹی نہیں کی تھی۔ صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ جمال کو سی آف کر کے دس بجے آفس آگئی تھیں اور آج جمال کے جانے کے ایک ہفتے بعد اچانک چھٹی کرلی تھی۔

میں بے چین ہو گیا۔ کیوں نہیں آئیں' کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ میں نے اکثر انہیں لنچ بریک میں دوائیں کھاتے دیکھا تھا مگر کبھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اتنی پابندی سے دوائیں کیوں استعمال کرتی ہیں۔

میں اپنے وقت سے پہلے ہی آفس سے اٹھ گیا تھا۔ بہت دیر تک بس اسٹاپ پر کھڑا اپنی بس کا انتظار کرتا رہا پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے رکشا روک لیا۔

صرف بیس منٹ بعد میں مسز جمال کے گیٹ پر موجود تھا۔ میں نے کال بیل بجائی۔ بیل بجتی رہی مسز جمال گیٹ کھولنے نہیں آئیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا' دور دور تک گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ان پوش علاقوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے۔ باہر سے تمام بنگلے ایک جیسی ویرانی لیے ہوتے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ کسی سے کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں رہنے والے ہمسایوں کو ایک دوسرے کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ کون کس حال میں ہے' سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے گیٹ کو اندر کی طرف دھکا دیا' گیٹ کھلتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مسز جمال اندر موجود ہیں۔

راہداری عبور کرتے ہی میرے کانوں سے بچوں کے شور ہنگامے کی آوازیں ٹکرائیں۔ اف! اتنا شور! جبھی مسز جمال کے کانوں تک بیل کی آواز نہیں گئی تھی۔ میں انہیں آواز دیتا ہوا لونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ آوازیں تو اوپری منزل سے آرہی ہیں۔ میں اوپر جانے کے لیے زینے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ میز پر رکھے رائٹنگ پیڈ پر میری نظر پڑی۔ وہاں اور بھی چند کاغذات اور قلم وغیرہ پڑے تھے۔ جیسے وہ ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہوں۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں نے وہ پیڈ اٹھا لیا۔ ارادہ یہی تھا کہ ایک نظر دیکھوں گا مگر اس تحریر پر میری نظریں جم کے رہ گئیں۔ یہ ایک خط تھا' میرے ہی نام تھا۔

"رمیز! کل جب میں آفس سے لوٹی تو بہت بے کل تھی۔ میں تمہاری نظروں کا مفہوم خوب سمجھتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میرے لیے مخلص ہو مگر میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تو صرف جمال کی ہوں۔ اپنے بچوں کی ماں ہوں جن کے دم سے میں جی رہی ہوں۔ آج میں تمہیں بتاؤں کہ مجھے جگر کا کینسر ہے مگر میں اپنے آپ سے جنگ لڑ رہی ہوں۔ جمال کے لیے' اپنے بچوں کے لیے' جو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے میں تمہیں وہ سب کچھ بتاؤں جو کسی کو نہیں بتایا۔ تمہیں میں کوئی اور درجہ تو نہیں دے سکتی مگر ہاں ایک رشتہ ایسا ہے جو تم سے جوڑ سکتی ہوں' وہ ہے دوستی کا رشتہ!

میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی' وہ ایک خوش حال گھرانا تھا۔ میرے پاپا اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ میری دادی نے پاپا کی نسبت بچپن ہی میں اپنی بھتیجی سے طے کر دی تھی مگر پاپا نے اپنی مرضی سے اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی۔ اپنی مرضی سے شادی کرنے کی سزا پاپا کو یہ ملی کہ والدین نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔

شروع شروع میں پاپا نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ ان کی خطا کو معاف کر دیں مگر انہوں نے نہ پاپا کی شکل دیکھی اور نہ ہی میری ماں کی۔

وقت بھاگتا چلا گیا۔ پاپا کی اپنی اشتہاری ایجنسی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر بہن بھائیوں اور ماں باپ سے کٹ جانے کا ملال ضرور تھا۔ شادی کے دو سال بعد میری پیدائش پر پاپا دادی کو منانے گئے مگر دادی نے ملنے سے انکار کر دیا۔ پاپا مایوس لوٹ آئے۔

پھر انہوں نے دادی یا اپنے بہن بھائیوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے میرا نام طیبہ رکھا۔ وقت گزرنے لگا۔ موسم تبدیل ہوتے چلے گئے۔ وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ میں نے شعور کی حدوں میں قدم رکھا تو مجھے احساس ہونے لگا کہ دنیا کی ہر چیز گھر میں موجود تھی۔ کبھی کسی چیز کے لیے سوچنا نہیں پڑا۔ بات منہ سے نکلتی اور پوری ہو جاتی مگر مجھے ایک کمی محسوس ہوتی تھی کہ ہم اپنے خونی رشتوں سے جدا ہیں۔

تایا' چچا' پھوپی سب ہوتے ہوئے ہم سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مما بھی اکیلی تھیں۔ ان کے صرف ایک بھائی تھے جو کینیڈا میں تھے۔ جن کا کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں شعور کی منزل پر پہنچی تو ہر لڑکی کی طرح میں نے بھی حسین خواب پلکوں پر سجانا شروع کر دیے۔

میں ان دنوں فورتھ ائیر میں تھی۔ مما کو میرے لیے اچھے رشتے کی تلاش تھی۔ میں تیکھے نقوش اور گلابی رنگت کی مالک تھی۔ شاید اسی لیے مما مجھے پیار سے گڑیا کہتی تھیں۔ مما کا خیال تھا کہ لڑکیاں خوب صورت ہوں تو جلد ہی اپنے گھر کی ہو جاتی ہیں مگر مما کا خیال غلط ثابت ہوا۔

ان دنوں میں امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ پاپا کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا۔ ہمارے سروں سے ایک شفیق سایہ اٹھ گیا تھا۔ پاپا کی تدفین میں چچا' پھوپو اور تایا سبھی شریک ہوئے مگر ہمارے سروں پر کسی نے شفقت کا ہاتھ نہ رکھا۔ رسمی سی تعزیت کر کے سب رخصت ہو گئے اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ پاپا کی اچانک جدائی نے مجھے اور مما کو ہراساں کر دیا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ مما نے ایک اچھی فرم میں جاب کر لی تھی۔ انہوں نے پاپا کا بزنس سمیٹ کر سارا پیسہ میری شادی کے لیے رکھ دیا تھا۔ انہیں میری شادی کی بہت فکر تھی۔ میرے لیے کئی لوگوں کے پیام آئے مگر کچھ مما کو پسند نہیں آئے اور کچھ کا لالچ صاف نظر آ گیا جو مجھ سے زیادہ میری دولت کے طلب گار

تھے۔

ہم دونوں بالکل اکیلے خاموشی کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ نہ کوئی خوشیوں میں خوش ہونے والا تھا اور نہ کوئی غم بانٹنے والا۔ ہم خود ہی اپنی خوشیوں پر خوش ہوتے اور اپنے دکھوں پر خود ہی آنسو بہا لیتے۔ میں ہر طرح سے مما کو ہنانے' بہلانے کی کوشش کرتی رہتی مگر میں اپنے میٹھے لفظوں سے مما کے زخموں کو مندمل نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ ایک دن ان کی حالت بگڑ گئی۔ میں مما کو لے کر اسپتال گئی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھیں۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری ثابت ہوئی۔ مما مجھے بالکل اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں بہت روئی' تڑپی مگر بے سود! مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔

وقت کا کام ہے گزرنا' وہ کسی کے لیے رکتا نہیں' چلتا چلا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری عمر بھی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے کئی طرح کے کورسز کیے' جاب بھی کرنے لگی مگر تنہائی کا دکھ مجھے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ نو عمری میں دیکھے ہوئے خوابوں میں سجا چہرہ اب بھی مجھے پریشان کیے رکھتا پھر ایک دن اچانک وہ چہرہ مجھے مل گیا۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ ہو بہو میرے ذہن کے کینوس پر بنی تصویر تھی۔ وہ شام بہت خوب صورت تھی۔ میں عذرا کے ساتھ آرٹ گیلری گئی تھی۔ وہاں تصویروں کی نمائش تھی۔ وہ وہیں اچانک مجھے مل گیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اس سے رابطہ کیا اور اسے گھر تک لے آئی اور پہلی ملاقات ہی میں اپنی محبت کا اظہار کر بیٹھی کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اسے اپنا پورا گھر دکھایا۔ اپنی خوشی میں اکیلے ہی خوش ہوتی رہی۔ میں اسے پا کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

عجیب اتفاق تھا وہ بھی میری طرح اکیلا تھا۔ اس کی محبت بے لوث تھی۔ اتنے مخلص شخص کو میں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو میری خوشی میں خوش تھا۔ یوں میں طیبہ سے مسز جمال بن گئی۔ میری تنہائیاں آباد ہو گئیں۔ اب میں سب کے سامنے بہت سرخ رو تھی مگر آج میں بہت بے کلی محسوس کر رہی ہوں۔ جبھی تم سے مخاطب ہو کر سب کچھ لکھ ڈالا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ سب کچھ میں تم سے روبرو کہہ رہی ہوں۔ اب میں بہت ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا ہے' دل ہلکا ہو گیا ہے۔ ایک بار مجھے میرے ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ جب دل پر بوجھ بڑھنے لگے تو کسی دوست کو مخاطب کر کے اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالو' دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ آج میں نے اسی بات پر عمل کیا ہے اور زندگی کا کیا بھروسا کب دغا دے جائے۔"

آخری سطر پڑھ کر میں چونک گیا۔ بچوں کے شور و غل کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ میں تیزی سے زینہ چڑھنے لگا۔ چھت پر صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اس کمرے کی طرف بڑھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اب آوازیں بالکل واضح آ رہی تھیں۔

"مما مما! میرا بھالو بھائی نے لے لیا ہے' دو مجھے دو۔"

"اجیہ! مما کو نہ ستاؤ' مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"فیضان کیوں شور کر رہے ہو؟ ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔ میں تھپڑ لگا دوں گی۔ بہت تنگ کرتے ہو تم مجھے۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مسز جمال کا تیز لہجہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ غصے میں بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں۔

"نہ تم مجھے چین سے بیٹھنے دیتے ہو نہ اپنے پاپا کو۔ کچھ خیال ہے' تمہارے پاپا سو رہے ہیں۔ اتنا شور مچایا ہوا ہے۔ چلو سب اپنی اپنی جگہ سکون سے بیٹھ جاؤ۔ مل کر کھیلا کرو۔ ہر وقت بہن کو ستاتے ہو' شاباش' بھالو اجیہ کو دو۔ عرفی اجیہ کو نہ چھیڑو' ادھر آؤ میرے پاس۔"

مسز جمال اب نرمی سے بچوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر لگتا تھا کہ بچے سدا کے ڈھیٹ تھے۔ ایک ہی تکرار تھی۔

"مما مما' میرا بھالو بھائی نے لیا ہے۔"

"اجیہ مما کو نہ ستاؤ' مما کی طبیعت خراب ہے۔"

میں کچھ دیر باہر کھڑا سنتا رہا پھر نہ جانے کیوں میں نے بغیر دستک دیے دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکا دیا۔ بے آواز دروازہ کھلتا چلا گیا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"جمال' جمال تم دیکھ رہے ہو' یہ بچے کتنے شریر ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں صرف تمہارے حد سے زیادہ لاڈ نے بگاڑا ہے مگر' مگر ایک بات ہے جمال' ان کا شور و غل ہی تو' میری زندگی ہے۔ یہ نہ بولیں تو پورے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔"

میں سانس روکے دم بخود کھڑا تھا۔ مسز جمال کی پشت میری طرف تھی اور چہرہ اس طرف تھا جہاں دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی تھی۔ یہ ایک پُرکشش اور وجیہہ مرد کی تصویر تھی۔ کشادہ پیشانی' بھوری آنکھیں' ہونٹوں کی خوب صورت دل فریب سی مسکراہٹ اس تصویر کو عجیب سا حسن بخش رہی تھی۔ کشادہ پیشانی پر بڑی خوب صورتی سے گھونگھریالے بال سنورے ہوئے تھے۔

کمرے میں سوائے مسز جمال کے کوئی نہیں تھا۔ ایک ساتھ تین ٹیپ چل رہے تھے۔ ملی جلی آوازیں' ایک شور ہنگامہ' مسز جمال مستقل ان کیسٹ کی چلتی ہوئی آوازوں کے ساتھ ساتھ بول رہی تھیں۔

"جمال جمال تمہیں پتا ہے' میرا کولیگ رمیز ایک مخلص دوست ہے۔ میں اس کی نظروں کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں مگر جمال اسے نہیں پتا' میں اب تمہارے ساتھ رہنے کی عادی ہو گئی ہوں۔ کوئی مجھے یہاں سے نکالنا بھی چاہے تو میں نہیں نکل سکتی۔ یہاں میری پوری دنیا آباد ہے۔ یہ میرے دل کی بستی ہے۔ میں آزاد ہوں اس بستی میں۔ نہ کوئی روکنے والا ہے نہ ٹوکنے والا۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ تمہیں پتا ہے جمال' رمیز مجھے کھوجنا چاہتا ہے مگر میں اسے یہ حق نہیں دوں گی کہ وہ میری بسی بسائی دنیا کو ملیا میٹ کر دے' جمال تمہارا دل کتنا بڑا ہے میں تم سے کچھ نہیں چھپاتی۔ ارے تم لوگ مانتے کیوں نہیں؟ فیضان' اجیہ کو نہ ستاؤ۔ چین سے بیٹھ جاؤ۔"

مسز جمال نے ہاتھ بڑھا کر تینوں ٹیپ آف کر دیے۔ کمرے میں یک لخت مکمل سناٹا چھا گیا۔ اب ویران کمرے میں صرف مسز جمال کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

میں دم بخود خاموش کھڑا ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔ مسز جمال کو اس دنیا سے باہر نکال لاؤں یا انہیں اسی خول میں بند رہنے دوں۔ آپ ہی بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

○☆○

پھر اس انداز سے بہار آئی

"اے میں تو کہوں' ہزار خوبیوں پر ایک خامی کو نظر انداز کر دینا ہی عقل مندی ہو گی۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گی تو بھی ایسا رشتہ نہ ملے گا۔"

بھابی بیگم کی چچی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اندر جاتے جاتے رک گئی۔

"ثمرہ! تم یہ تو سوچو' کب تک عریبہ کو بٹھائے رکھو گی؟"

"نہیں چچی جان' میں نے کبھی بھی عریبہ کو بوجھ نہیں سمجھا۔" بھابی بیگم نے جلدی سے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا پھر کچھ رک کر بولیں "آپ کی بات میری سمجھ میں تو آ رہی ہے مگر ڈرتی ہوں کہیں یہ الزام نہ آ جائے کہ بوجھ سمجھ کر ایسا کر دیا۔"

"ارے لوگوں کے بارے میں سوچو گی تو ہو چکا کام' لوگوں کا کیا ہے انہیں تو باتیں بنانے کو بہانا چاہیے۔ سمجھ دار تو وہ ہوتے ہیں جو لوگوں کی پروا کیے بغیر اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں اور بھلا خرم میں برائی کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' گریڈ ون افسر ہے بینک میں' ایسا سجیلا نوجوان ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ گھرانا میرا دیکھا بھالا ہے۔ گھر ہے کہ محل' گل ہاؤس ڈیفنس کے علاقے کی سب سے خوب صورت کوٹھی ہے۔ گھر میں نوکر ہیں' دولت کی ریل پیل ہے۔ سجاد علی مرحوم کا سارا پھیلا ہوا بزنس بڑے بیٹے فیروز نے سنبھالا ہوا ہے۔ دو بیٹے ملک سے باہر ہیں۔ سب کچھ ہی اچھا ہے بس ایک خامی معمولی سی ہے کہ خرم کو رات میں نظر نہیں آتا ہے۔"

"یہ معمولی خامی ہے۔" عریبہ دروازے کے پاس کھڑی سوچ کر رہ گئی۔

"مگر چچی جان! کیا ان لوگوں نے علاج وغیرہ نہیں کرایا؟" بھابی بیگم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بہت علاج کرایا مگر ہر ڈاکٹر نے مایوس کیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے آپریشن سے بھی روشنی بحال ہونا ممکن نہیں ہے اگر کبھی بینائی خود ہی ٹھیک ہو گئی تو یہ معجزہ ہو گا۔ ہونے کو کیا نہیں ہوتا۔ بیگم سجاد بتاتی ہیں ٹائیفائڈ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہوگیا تھا' اسی کے بعد اچانک ایک دن پتا چلا کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی آنکھوں کی بینائی جانے لگتی ہے۔ شب کوری شاید اسی مرض کو کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے ثمرہ' یہ رشتہ پکڑلو تو بہتر ہے۔ اب یہی سوچو اگر شادی کے بعد کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟"

"مگر امجد تیار ہوں تب کی بات ہے نا۔"

"اگر مگر چھوڑو' امجد کو راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ سوچ لو پورا گھرانا ماشاء اللہ سے بہت اچھا ہے۔ اب میری فوزیہ کو دیکھ لو' کتنی خوش ہے ان کے گھر میں' سب میں بہت محبت ہے۔ بیگم سجاد چار بیٹیوں کی شادی کرچکی ہیں' دو نے تو باہر سکونت اختیار کرلی' باقی دو بہوئیں ساتھ گل ہاؤس میں میل محبت سے رہتی ہیں۔ بہوئیں بھی ماشاء اللہ سے بڑی نیک سیرت ملی ہیں اور تمہاری عریبہ تو ماشاء اللہ سے صورت اور سیرت دونوں میں اعلیٰ ہے۔ سب کی آنکھ کا تارا بن جائے گی۔"

"میں ذکر کروں گی امجد سے۔" ثمرہ نے کہا۔

"ذکر نہیں' امجد کو تمہیں راضی کرنا ہے۔ اتنے اچھے رشتے قسمت سے ہی ملتے ہیں' بیگم ساجد نے تو ایک ہی بار عریبہ کو میرے گھر پر دیکھا ہے' بس جب سے وہ فوزیہ سے اصرار کررہی ہیں کہ عریبہ کی بھابی کے پاس لے کر چلو۔ وہ تو میں نے سوچا پہلے میں تمہیں تو ساری بات بتادوں' کبھی تم جلد بازی میں صاف انکار کردو۔ اچھا اب میں چلوں گی۔" انہوں نے کہا۔

باہر کھڑی عریبہ تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کیا میں ایسا بوجھ بن گئی ہوں کہ میرا رشتہ ایک ایسے شخص سے جوڑا جارہا ہے جسے رات کو دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے' اتنی بھیانک؟ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ وہ بیٹھی سوچے جارہی تھی۔

اماں آج زندہ ہوتیں تو کوئی بھی اس کے بارے میں یوں نہ سوچتا۔ عریبہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ تین سے چھوٹی اور دو سے بڑی' اماں کا انتقال عرصہ پہلے ہوچکا تھا جب وہ میٹرک میں تھی۔ اماں کے سامنے امجد' منیر اور مجید کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ منیر اور مجید شادی کے بعد الگ گھر میں شفٹ ہوگئے تھے مگر امجد اور ثمرہ ساس' خسر کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ثمرہ ویسے بھی بہت سمجھ دار تھیں' چھوٹے بہنوں کا سبھی کا بہت خیال رکھتیں' سب سے بڑی بہو تھیں' اس لیے سب انہیں بھابی بیگم کہتے تھے۔ ثمرہ کی شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے مگر اولاد سے محروم تھیں۔ منیر کے دو بیٹے اور مجید کی ایک بیٹی تھی۔ کبھی کبھی یہ لوگ بھی رہنے آجاتے تو گھر کی رونق میں اضافہ ہوجاتا۔ عریبہ ان دنوں زیرِ تعلیم تھی مگر ماں کو اس کی فکر بہت زیادہ تھی۔ مناسب رشتے کی جستجو اور خواہش لیے ہی اماں اچانک ایسی بیمار ہوئیں کہ جاں بر نہ ہوسکیں۔

وقت پرواز کررہا تھا۔ عریبہ نے بی ایڈ کے بعد ایک گورنمنٹ اسکول میں جاب کرلی تھی۔ ثمرہ اور امجد کو اس کی بہت فکر تھی۔ اس سے دو چھوٹے بھائی اکرام اور عبید بھی تعلیم سے فارغ ہوکر اچھی جاب پر تھے۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ وقت کچھ اور آگے سرکا تو اکرام اور عبید کی بھی شادی ہوگئی۔ اکرام کے سسرال والوں نے جہیز میں فلیٹ دیا تھا۔ اکرام کی دلہن رخصت ہوکر وہیں گئی تھیں۔ عبید شادی کے ایک سال

تک امجد اور ثمرہ کے ساتھ ہی رہے پھر انہوں نے بھی ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یوں اب اس گھر میں ثمرہ' امجد' عریبہ اور ابا جان رہ گئے تھے۔ ابا جان' عریبہ کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے۔

"عریبہ! عریبہ' ارے اندھیرے میں کیا کررہی ہو؟ لائٹ تو جلالی ہوتی۔ مغرب کی اذان ہوچکی ہے۔" بھابی بیگم کی آواز پر وہ چونک گئی۔ سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بھابی بیگم نے خود ہی لائٹ جلائی۔ ان کی نظر عریبہ کے چہرے پر پڑی' وہ بہت بجھی بجھی سی نظر آرہی تھی۔

"کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے؟" بھابی بیگم نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"نہیں' کچھ نہیں بھابی بیگم' بس سر میں درد ہورہا ہے۔" عریبہ نے آہستہ سے کہا۔

"تو کوئی ٹیبلٹ کھالو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں پھر بولیں "عریبہ' آج چچی جان آئی تھیں۔"

"اچھا۔" عریبہ نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"ہاں' تم شاید سو رہی تھیں۔" بھابی بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں پھر یوں گویا ہوئیں "عریبہ! چچی جان تمہارے لیے ایک بہت اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ تمہیں تو اندازہ ہوگا میرے میکے والے تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں' چچی جان تو کہتی ہیں کہ اگر میرا اپنا بیٹا ہوتا تو میں عریبہ کو اپنی بہو بناتی۔ وہ تو جب آتی ہیں تمہارے ہی قصیدے پڑھتی رہتی ہیں۔ اتنی تعریفیں کرتی ہیں کہ اللہ کی پناہ۔" بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔ عریبہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"عریبہ! خرم' فوزیہ کا دیور ہے۔ فوزیہ کی شادی پر میں نے بھی ایک بار دیکھا ہے' بہت اچھا لڑکا ہے' ایم اے کیا ہوا ہے' بینک میں افسر ہے اللہ کی مرضی اتنی ساری خوبیوں میں ایک خامی ہوگئی ہے کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی آنکھوں کی بینائی غائب ہوجاتی ہے' بہت علاج کرا کے مایوس ہوچکے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بھابی بیگم نے عریبہ کی طرف دیکھا' عریبہ کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بیٹھی ہونٹ کاٹ رہی تھی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خاموش بیٹھی تھی۔

"عریبہ! میں تم سے بات کررہی ہوں۔" بھابی بیگم نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"آپ کا خیال ہے اس رشتے میں چار چاند لگے ہوئے ہیں؟" اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

بھابی بیگم بولیں "اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' پوسٹ بھی اعلیٰ ہے' باحیثیت ہے' یہ تو تمہیں پتا ہے' داغ تو چاند میں بھی ہوتا ہے اور عریبہ یہ کوئی ایسی خامی نہیں جسے نظرانداز نہ کیا جائے۔"

"بھابی بیگم! ساری خوبیوں پر یہ ایک خامی حاوی ہے۔ یہ ساری زندگی کا مسئلہ ہے۔"

"دیکھو عریبہ' زندگی میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے' یہ تو کسی کو نہیں پتا کہ آگے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"مگر جو نظر آرہا ہے اس سے نظریں تو نہیں چرائی جاسکتیں۔" عریبہ نے آہستہ سے کہا "میں شاید آپ لوگوں کے لیے بوجھ بن گئی ہوں۔" وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

بھابی بیگم ایک دم نرم پڑتے ہوئے بولیں "عریبہ! بات بوجھ کی نہیں ہے وقت اور حالات کی ہے۔ اچھے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رشتے روز روز نہیں ملتے اور تمہاری عمر جس تیزی سے گزر رہی ہے' تمہیں اندازہ ہے ابا جان تمہارے لیے کتنا فکر مند رہتے ہیں۔ میری نظر میں ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے یہ رشتہ مناسب ہے۔" بھابی بیگم نے دبے دبے لفظوں میں اس کی گزرتی ہوئی عمر کا طعنہ دے دیا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی' بولی کچھ نہیں۔

بھابی بیگم اٹھتے ہوئے بولیں "آرام سے مجھے سوچ کر جواب دینا' میں کوئی تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ وقت اور حالات کو سامنے رکھ کر سوچو گی تو ٹھیک فیصلے پر پہنچ جاؤ گی۔" بھابی بیگم اتنا کہہ کر جا چکی تھیں اور وہ گم صم بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟

آج چھٹی کا دن تھا گھر میں بڑی رونق نظر آ رہی تھی۔ امجد نے چاروں بھائیوں کو بلایا ہوا تھا۔ وہ سب اپنے بیوی بچوں سمیت موجود تھے۔ گھر میں ایک شور تھا۔ خوب ہلہ گلہ تھا۔ ڈیک پوری آواز سے بج رہا تھا۔ چھوٹی بھابی ذکیہ کو گانے سننے کا بڑا شوق تھا اور آج تو عریبہ کی بات پکی ہو رہی تھی وہ اس خوشی کے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب اپنی من مانی کر رہی تھیں۔

عریبہ اپنے کمرے میں اداس بیٹھی تھی۔ "تو عریبہ تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو گیا ہے' آج اسے اماں بہت یاد آ رہی تھیں۔ شاید میری قسمت میں ایسا ہی ہے۔ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ میری کسی نے نہ سنی شاید بھابی بیگم ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ گیا وقت واپس نہیں آتا۔

اور پھر وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جو ہو رہا ہے اسے خوشی سے قبول کر لیا جائے اور شاید مجھے ساری زندگی سمجھوتا کرتے ہی گزارنی پڑے۔

عریبہ کی زندگی میں اچانک انقلاب آ گیا تھا' چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی اور وہ عریبہ خرم بن کر گل ہاؤس میں آئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ محبتوں اور چاہتوں کے حصار میں آ گئی ہے' پورے گھرانے نے اس کا استقبال یوں کیا کہ وہ اپنی قسمت پر رشک کرتی مگر اس کا مجازی خدا اس کا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے اس سے بہت کھنچا کھنچا سا تھا۔ خرم کا رویہ اس کے ساتھ بہت سرد سا تھا۔ وہ جتنا اس کی طرف بڑھنا چاہتی وہ اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔

وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔

اس کی شادی کو ایک سال ہو گیا۔

اس نے اپنی وفا' اپنی محبت' اپنی چاہت سے خرم کا دل جیتنا چاہا مگر وہ ناکام رہی تھی' اب تو خرم بات بات پر اس سے الجھ پڑتا تھا۔ عریبہ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ خرم کا سلوک اس کے ساتھ اتنا تلخ کیوں ہے؟

عریبہ نے خرم کی بینائی کے سلسلے میں کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ وہ چاہتی تھی خرم کا آپریشن ہو جائے' اس طرح ایک امید سی تھی کہ شاید آنکھوں کی بینائی ٹھیک ہو جائے ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس طرح مکمل بینائی جانے کا خطرہ بھی ہے۔ عریبہ ڈاکٹروں کی طرف سے مایوس ہو گئی تو اس نے خدا سے دعا کرنی شروع کر دی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور خرم کی بینائی ٹھیک ہو جائے۔ اس کی لگن سچی تھی کہ ایک دن جب وہ سب رات کو بیٹھے ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے' خرم اپنے کمرے میں لیٹے تھے کہ ان کی مسرت سے لبریز

آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "عریبہ۔ عریبہ' ادھر آؤ۔" عریبہ اس لہجے پر چونک گئی۔ آج پہلی بار خرم نے اتنی اپنائیت سے اسے پکارا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی "عریبہ! مجھے نظر آ رہا ہے۔" خرم نے بتایا عریبہ نے بے یقینی سے خرم کی طرف دیکھا۔

"کیا میں پاگل ہوں جو یوں دیکھ رہی ہو' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" خرم کا لہجہ اتنا تیز تھا کہ بیگم سجاد گھبرا کر کمرے میں آ گئیں۔

"کیا ہو گیا بیٹا؟ کیوں چیخ رہے ہو؟"

"امی' انہیں سب نظر آ رہا ہے۔" عریبہ نے بتایا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹی' یہ سب تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔" بیگم سجاد نے عریبہ کی پیشانی چوم لی۔ عریبہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"عریبہ' میں نے بھی خرم کے لیے بڑی منتیں مانی ہیں۔ وہ مجھے پوری کرنی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بیگم سجاد خرم اور عریبہ کو لیے باہر ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔

"ارے تم لوگوں نے سنا' میرے بیٹے خرم کی آنکھوں کی بینائی ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"سچ خرم؟" فوزیہ نے خرم کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ ہاں بھابی مجھے سب نظر آ رہا ہے۔"

فوزیہ بولی "خرم' اس بات کا کریڈٹ سارا عریبہ کو جاتا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" بیگم سجاد نے عریبہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان' میرا خیال ہے اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے ایک زبردست فنکشن ہونا چاہیے۔" فوزیہ نے کہا۔

"ہاں فوزیہ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ میں جلد ہی اس کا اہتمام کروں گی۔" بیگم سجاد نے کہا "لیکن سب سے پہلے میلاد' قرآن خوانی اور نذر و نیاز' صدقے ادا کروں گی۔"

عریبہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ بہت مسرور ہو گئی تھی۔ ان دنوں خرم کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت بہتر ہو چلا تھا شاید اس کی دعائیں' وفائیں' اس کی محبتیں رنگ لائی تھیں۔

اس شام وہ خرم کے ساتھ بیٹھی مستقبل کے منصوبے بنا رہی تھی کہ وہ اچانک کھڑکی کے پردے برابر کرنے اٹھی۔ پردے برابر کرنے سے پہلے اس نے ایک بار کھڑکی سے باہر جھانکا اور بولی "خرم پورچ میں گاڑی رکی ہے' کوئی آیا ہے۔" خرم نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔

"آئی۔ سی' یہ تو مائرہ ہے' میری کلاس فیلو۔" خرم نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا پھر عریبہ سے بولے "تم سے مائرہ پہلی بار ملے گی۔ ٹھیک طرح سے تیار ہو کر آنا میں ڈرائنگ روم کی طرف جا رہا ہوں۔ شکور گیٹ کھولو مائرہ آئی ہے۔" انہوں نے کمرے سے باہر آ کر شکور سے کہا۔

یہ نام سنتے ہی سامنے بیٹھی بیگم سجاد کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ابھی وہ کچھ کہنے والی تھیں کہ مائرہ پرس ہلاتی ہوئی شکور کے ساتھ ادھر ہی آ گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ہاؤ آر یو؟" اس نے اٹھلاتے ہوئے خرم کو دیکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟" خرم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خرم اسے لیے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ فوزیہ ڈرائنگ روم سے باہر آرہی تھی۔

"یہ میری چھوٹی بھابی فوزیہ ہیں۔" خرم نے مائرہ کو بتاتے ہوئے فوزیہ سے کہا "اور بھابی یہ مائرہ ہے میری کلاس فیلو۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" فوزیہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ مائرہ مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئی۔

صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "سچ خرم مجھے جب پتا چلا کہ تم بالکل ٹھیک ہوگئے ہو یقین کرو مجھے تو بے حد خوشی ہوئی۔"

"مگر تمہیں کیسے پتا چلا یہ تو ابھی صرف چند دنوں کی بات ہے؟" خرم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے خرم یہ خبر تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ کل شام اچانک شکیل سے ملاقات ہوگئی اسی سے معلوم ہوا۔"

"اوہ شکیل سے دو روز پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔" خرم نے کہا۔

مائرہ بولی "خرم پہلے میں نے سوچا تمہیں فون کرلوں مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ اچانک مجھے دیکھ کر اچھل جاؤ گے کیوں میرا خیال غلط تھا؟" مائرہ نے شوخ نظروں سے خرم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ حقیقت ہے میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ پانچ سال بعد ملاقات ہوئی ہے یہ عرصہ بڑی اذیت میں گزرا ہے۔" خرم نے کچھ یاد کرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں کہا پھر سوچتے ہوئے بولا "تمہارے وہ شوہر نامدار کہاں ہیں آج کل؟"

"تمہیں نہیں پتا۔ ان کی تو میں نے چھٹی کروی۔" مائرہ نے ایک ادا سے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" خرم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ مائی ڈیئر خرم میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شادی کے ایک سال بعد ہی طلاق لے لی تھی۔ وہ تو بس مما کی ضد کی وجہ سے مجھے حامی بھرنی پڑی تھی۔ خیر رات گئی بات گئی۔ اب میں آزاد ہوں۔" مائرہ نے پرجوش انداز میں کہا۔ اسی لمحے عریبہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی لائٹ کاسنی کلر کی ساری میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ مگر آنکھوں میں تجسس نمایاں تھا وہ مائرہ کو دیکھ رہی تھی جو خرم کے برابر صوفے پر بیٹھی چہک رہی تھی۔

"مائرہ ان سے ملو ماریہ میری وائف عریبہ ہیں۔"

"وہاٹ؟ تم نے شادی کرلی؟" مائرہ کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی "شکیل نے تو مجھے نہیں بتایا۔" مائرہ نے پھر کہا۔

"اچھا! مگر شکیل میری شادی پر آیا تھا ایک سال ہوا ہے ہماری شادی کو۔" خرم نے آہستہ سے کہا۔

مائرہ خاموش بیٹھی تھی کچھ نہ بولی۔ نوکر کوک لے کر آگیا۔ عریبہ نے کوک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"میں فارغ ہوں بس۔ سیر و تفریح کرتی پھر رہی ہوں ابھی پچھلے دنوں کینیڈا کے ٹور سے لوٹی ہوں۔" مائرہ نے شان بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر وہ جلد ہی اٹھ گئی۔

"اچھا خرم پھر ملاقات ہوگی۔" مائرہ چلی گئی تھی عریبہ اور خرم اسے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ اچانک مائرہ گیٹ پر پہنچ کر بولی۔

"خرم! کل شام تم گھر آنا میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"او۔ کے!" خرم نے خوش دلی سے کہا وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ خرم عریبہ کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف آنے لگا سامنے سے آتی بیگم سجاد نے خرم سے کہا "وہ لڑکی مائرہ گئی؟"

"جی امی چلی گئی۔" خرم نے مختصر جواب دیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آگیا۔

اس رات خرم بہت زیادہ مضطرب تھے۔ رات کافی گزر گئی تھی کمرے میں زیرو بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خرم بیڈ پر کروٹ لیے لیٹا تھا۔ بیڈ کے دوسری سائڈ پر عریبہ لیٹی ہوئی تھی۔ دونوں بے چین تھے۔ عریبہ مائرہ سے مل کر پریشان تھی۔ اسے وہ لڑکی کچھ عجیب سی لگی تھی۔ وہ خرم کے ساتھ بہت چپک رہی تھی۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ خرم کی شادی کا سن کر چونک گئی تھی۔ مائرہ سے خرم کا کس قسم کا تعلق تھا؟ کیا خرم اور مائرہ ایک دوسرے کو.... نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ لیٹی سوچے جا رہی تھی۔

خرم عریبہ کی سوچوں سے بے خبر گزرے ماضی میں غوطہ زن تھے۔ مائرہ نے اچانک آکر اسے ڈسٹرب کردیا تھا۔ وہ مائرہ کو دیوانہ وار چاہتا تھا۔ پچھلے کئی سال سے وہ مائرہ کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر وہ ناکام رہا تھا مگر عریبہ سے شادی کے بعد وہ ہر ممکن کوشش میں لگا رہا تھا کہ اس کے ذہن سے مائرہ کا نقش مٹ جائے اب وہ کسی حد تک اس میں کامیاب ہونے والا تھا کہ مائرہ نے اچانک آکر اس کی زندگی میں ہلچل مچادی تھی۔ دبی ہوئی محبت کی چنگاری دل کے کسی کونے میں سلگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

مائرہ سے پہلی ملاقات سے اب تک کے حالات دہرانے لگا۔

اسے یاد تھا اس نے مائرہ سے ایک بار کہا تھا "مائرہ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ہماری ملاقات چند دنوں کی ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔" مائرہ کھل کھلا کر ہنس دی اور بولی "خرم ہم دونوں محبت کے راستے پر بہت دور نکل آئے ہیں۔ تم جلد اپنی امی کو ڈیڈی کے پاس بھیجو۔"

"ہاں مائرہ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہیں سوچنے سوچنے میں وقت نہ نکال دینا۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ میں فورتھ ایر مکمل کرلوں۔ اس کے فوری بعد وہ میری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"کیوں کیا ان کی نظر میں کوئی ہے؟" خرم نے پوچھا۔

"ہوں ڈیڈی کی نظر میں تو ابھی کوئی نہیں ہے مگر مما کی نظر اپنے بھتیجے باقر پر ہے۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"اوہ... آئی۔ سی۔" خرم نے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر کہا پھر کچھ سوچ کر بولا "مائرہ! آج کل گھر میں مسعود بھائی کی شادی کا چکر چل رہا ہے۔ میں بڑی بھابی سے بات کروں گا وہ امی سے بات کریں گی۔" خرم نے کہا۔

وقت بڑی تیزی سے گزر گیا تھا۔ بیگم سجاد' مسعود کی شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھیں۔ ایک رات ڈائننگ ٹیبل پر سبھی موجود تھے۔ بیگم سجاد' مسعود' فیروز' بڑی بھابی وغیرہ۔ بڑی بھابی نے کھانا کھاتے ہوئے مسکرا کر خرم کی طرف دیکھا اور بولیں "امی جان' اب خرم کے لیے بھی لڑکی دیکھ لیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے' میں مسعود کی شادی سے نمٹ لوں تو خرم کے لیے بھی سوچنا ہے۔ اب خرم' ماشاءاللہ سے تعلیم سے فارغ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد اس کی مرضی ہے بزنس کرلے' فیروز کی طرح یا کوئی جاب وغیرہ۔"

"امی لڑکی تو خرم نے خود ہی دیکھ لی ہے۔" بڑی بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں میاں' یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟" مسعود نے مسکراتے ہوئے خرم سے پوچھا۔

بیگم سجاد کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات نمایاں ہوگئے تھے۔ وہ بولیں "کون ہے وہ لڑکی؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟" انہوں نے خرم سے سوال کیا۔

"امی! مائرہ میری کلاس فیلو ہے۔ نواب حشمت علی کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"کیا! نواب حشمت علی تو تمہارے ڈیڈی کے بہت قریبی دوستوں میں سے ہیں۔" بیگم سجاد نے خوش ہوتے ہوئے کہا "مگر ان کی فیملی سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی تمہارے ڈیڈی دوستی گھر سے باہر تک ہی رکھنے کے عادی تھے۔ نہ وہ ان کو کبھی لے کر آئے اور نہ ہی خود کبھی ان کے گھر مجھے لے کر گئے۔ ذکر بہت زیادہ کرتے رہتے تھے اس لیے مجھے یہ نام یاد رہ گیا۔ تم حشمت علی سے ملے ہو؟" بیگم سجاد نے خرم سے پوچھا۔

"جی نہیں امی' کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ ایک دو بار مائرہ کے ساتھ گیا تو ان کی مما سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میں مسعود کی شادی سے فارغ ہولوں تو پھر چلوں گی۔"

"تم ایسا کرو نا ان کی فیملی کو مسعود کی شادی پر بلالو اس طرح ہم سبھی مائرہ کو دیکھ لیں گے۔" بڑی بھابی نے تجویز پیش کی۔

"ہاں خرم' بڑی دلہن ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" بیگم سجاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے مسعود سے بھی کہا تھا کہ اگر کوئی لڑکی تمہاری نظر میں ہو تو بتا دو۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے مسعود کی طرف دیکھا۔

"جی امی' آپ نے تو کہا تھا مگر میں ان خرافات سے دور ہوں۔ آپ کی پسند میری پسند' بس۔" مسعود نے بڑی سعادت مندی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"اب زیادہ مکھن نہ لگاؤ۔" بڑی بھابی نے ہنستے ہوئے مسعود سے کہا۔ خرم بڑے خوشگوار موڈ میں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ یہ خبر جلد سے جلد مائرہ کو سنانا چاہتا تھا۔ وہ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں مائرہ کا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف مائرہ نے فون اٹھایا "خرم کہو کیسے اس وقت یاد کرلیا؟"

"ایک خوش خبری سنانی تھی تمہیں؟" خرم نے شوخ سے لہجے میں کہا۔

"ضرور سناؤ میں سن رہی ہوں۔" مائرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ بولا "مائرہ' بہت جلد میری امی تمہارے گھر آنے والی ہیں۔"

"سچ خرم' خرم' تمہاری امی مان گئیں۔" مائرہ نے پوچھا۔

"ہوں' میری امی آئیڈیل ماں ہیں۔ اولاد کی پسند کا پہلے خیال رکھتی ہیں۔"

"مگر خرم' میری مما تو بہت مختلف ہیں وہ اپنے ہر فیصلے اولاد پر زبردستی لاد دیتی ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہیں وہ..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"خیر تم فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔" خرم نے کہا پھر دونوں کافی دیر تک فون پر باتیں کرتے رہے۔

بیگم سجاد' مسعود کی شادی سے فارغ ہوئی تھیں کہ انہیں اچانک پریشانیوں نے گھیر لیا۔ خرم ان دنوں سخت بیمار ہوگیا تھا۔ ان دنوں ٹائیفائڈ کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ خرم بھی اس کا شکار ہوگیا۔ مسلسل بخار نے اسے بہت کمزور کردیا تھا اور پھر ایک دن تو گل ہاؤس میں قیامت ہی گزر گئی جب اچانک خرم کی آنکھوں کی روشنی غائب ہوگئی۔ یہ بیماری عجیب قسم کی تھی کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی خرم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ہر چیز اندھیرے میں ڈوب جاتی تھی۔ اس عجیب انداز کی بیماری نے خرم کو ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی اس پر وحشت سی سوار ہوجاتی۔

بیگم سجاد جوان بیٹے کی یہ بے بسی دیکھ کر پریشان سی رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے بہت علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتنا ضرور ہوا... علاج کرنے سے کہ بخار وغیرہ تو ٹھیک ہوگیا۔ اب صحت یاب ہوگیا تھا اور ان دنوں اسے جاب بھی مل گئی تھی۔ بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر لگ گیا تھا۔

زندگی معمول کی طرح گزرنے لگی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ بالکل اچھی طرح ہر کام کرتا' سب کچھ نظر آتا تھا مگر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے یہ بات مائرہ سے بھی پوشیدہ رکھی تھی۔ وہ جب کبھی رات کے فنکشن وغیرہ میں جانے کو کہتی' وہ ٹال جاتا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر مائرہ کو اس حقیقت کا پتا چل گیا تو وہ اس سے دور ہوجائے گی۔

ایک شام وہ اپنے کمرے میں لیٹا سوچوں میں گم تھا کہ بیگم سجاد اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"خرم بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ مائرہ کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جاؤں' مائرہ کو تو پتا ہے نا تمہاری اس بیماری کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں امی' میں نے مائرہ کو کچھ نہیں بتایا ہے۔" خرم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں' کیا تمہیں اس پر اعتماد نہیں ہے۔ کیا وہ اس موڑ پر تمہارا ساتھ چھوڑ دے گی؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا امی اگر اس نے اس بات کو نظرانداز کر بھی دیا تو مجھے خدشہ ہے اس کے ڈیڈی نہیں مانیں گے۔"

"بیٹا! اگر مائرہ سنجیدہ ہے تو وہ اپنے والدین کو راضی کرلے گی۔ تم بات تو کرو مائرہ سے۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ٹھیک ہے امی! بات کروں گا۔" خرم نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ بیگم سجاد اٹھ کر باہر آ گئیں۔

شام ڈھلنے سے پہلے ہی وہ آفس سے سیدھا مائرہ کے گھر پہنچ گیا۔ کال بیل کی آواز پر گیٹ مائرہ نے ہی کھولا۔

"ارے تم خرم، میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہارے آفس آنے والی تھی میں۔"

"اچھا، کیوں کوئی خاص بات؟" خرم نے اسے پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں، بہت خاص۔" مائرہ نے مسکرا کر کہا اور بولی "کیا سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے معلوم کرلوگے، اندر نہیں آنا۔"

خرم ایک دم مسکرا دیا تھا اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"پتا ہے خرم آج تو ڈیڈی بھی گھر پر ہیں، تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"ہاں مائرہ، مجھے بھی تمہارے ڈیڈی سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ ویسے تم کوئی خاص بات بتانے والی تھیں۔" خرم نے اسے یاد دلایا۔

"بڑے بے صبرے ہو۔" یہ کہتے ہوئے مائرہ ایک ادا سے مسکرائی پھر بولی "خرم میں نے ایک بار کہا تھا کہ ڈیڈی میری بات کبھی نہیں ٹالتے، بس وہی ہوا مما نے کل ہی مجھے باقر کے پرپوزل کا بتایا کہ ممانی جان نے باقر کے لیے مما سے بات کی ہے اور یہ تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مما باقر کو بہت چاہتی ہیں۔ میں نے تمہارا ذکر کیا تو ٹال گئیں، کوئی جواب نہیں دیا مگر مجھے ڈیڈی سے امید تھی، وہی ہوا ڈیڈی نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے مگر وہ ایک بار تم سے ملنا چاہتے ہیں اور یہی بتانے میں تمہارے پاس آ رہی تھی۔" مائرہ نے مسکراتے ہوئے اپنی بات ختم کرکے خرم کی طرف دیکھا خرم ایک بڑی کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے ایک طرف سے تو اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ فیصلہ مائرہ کو کرنا ہے مگر کیا مائرہ کے ڈیڈی یہ خامی برداشت کرلیں گے، کیا مائرہ کا مستقبل ایسے نوجوان سے سونپ دیں گے جو ایک لاعلاج سی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے؟ کیا مائرہ اسے اس روپ میں قبول کرلے گی؟ بہت سارے سوال اس کے ذہن میں چکر کھا رہے تھے مائرہ، مائرہ! مجھے تم پر تو یقین ہے کہ تم مجھے ہر روپ میں قبول کرلوگی۔ مائرہ میں بھی تمہیں بہت شدتوں سے چاہتا ہوں، تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں۔ "کیا سوچنے لگے" مائرہ نے غور سے خرم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم چونک گیا "ہوں، کچھ نہیں۔ مائرہ! میں بھی تمہیں ایک خاص بات بتانے آیا ہوں۔" خرم کا بے حد اداس [illegible] تھا۔

مائرہ اس کے لہجے کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "کیا بات ہے؟ جو بھی ہے اب کہہ ڈالو۔" مائرہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مائرہ! میں ایک عجیب قسم کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میری آنکھوں کی بینائی بہت ویک ہو گئی ہے۔"

"ارے تو یہ [illegible] سی خاص بیماری ہے، آنکھیں ٹیسٹ کرا کے چشمہ لگالو۔" مائرہ نے بے پرواہی سے کہا۔

"تم سمجھتی نہیں مائرہ، مجھے دن میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے مگر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میری

آنکھوں کی بینائی غائب ہو جاتی ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔"

"وہاٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ خرم پلیز اتنا سیریس مذاق مت کرو کہ میرا دل ڈوب جائے۔"

"مائرہ میں سنجیدہ ہوں۔ مذاق نہیں کر رہا۔" خرم نے آہستہ سے کہا۔ مائرہ ہونٹ کاٹتی ہوئی اچانک کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"خرم، یہ سب کب سے ہے اور تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب میں ڈیڈی سے کیا کہوں گی؟" وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"مجھے پتا تھا مائرہ، تم یہ سب سن کر بے چین ہو جاؤ گی اس لیے تو میں تمہیں بتاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میں جانتا ہوں، تم مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہو۔"

"مگر، مگر خرم میں ڈیڈی کو....." ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اچانک حشمت علی کمرے میں داخل ہوئے اور بولے۔

"بہت خوب، تو مائرہ یہ ہے تمہارا انتخاب۔"

"جی ڈیڈی، یہ خرم....."

"میں سب سن چکا ہوں، کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" نواب حشمت نے مائرہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مائرہ کچھ نہیں بولی۔

"مائرہ! یہ زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں ایک ایسے نوجوان کے ہاتھ میں تمہارا مستقبل سونپ دوں جو کسی صورت بھی تمہارے قابل نہیں۔ لوگوں کے سامنے مجھے تماشا بنانا چاہتی ہو کہ لوگ کہیں کہ نواب حشمت کی اکلوتی بیٹی....."

"پلیز ڈیڈی، زندگی مجھے گزارنی ہے۔"

"اوہ بے بی، ابھی تمہیں عقل نہیں ہے، جذبات کے ریلے میں فیصلہ کروگی تو پچھتاؤ گی، تمہاری شادی باقر سے ہوگی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اوکے مسٹر خرم، آپ جا سکتے ہیں۔" نواب حشمت نے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ مائرہ سسکتے ہوئے بولی۔

"خرم، میں بھی ڈیڈی کی بات سے اتفاق کروں گی کہ زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔"

خرم لٹا لٹا سا گھر واپس آ گیا۔

ان دنوں وہ بہت افسردہ سا رہنے لگا تھا۔ مائرہ کو بھلانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ گھر میں سبھی کو اس کے دکھ کا احساس تھا۔ زندگی بہت مایوس انداز میں گزر رہی تھی پھر اس نے سنا مائرہ نے باقر سے شادی کرلی اور وہ شادی کے بعد باقر کے ساتھ امریکا چلی گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں ویرانیاں شامل ہو گئی تھیں۔ بیگم سجاد جلد سے جلد مناسب سمجھ دار لڑکی کی تلاش میں تھیں جو خرم کو اس کی اس خامی سمیت خوشی سے قبول کرلے پھر انہیں عریبہ نظر آ گئی، نہ جانے کیوں انہیں یہ لڑکی بہت سمجھ دار لگی تھی۔ یوں عریبہ خرم کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار بن کر آئی مگر خرم ہمیشہ اس سے دور دور رہا مگر عریبہ نے بھی ہمت نہ ہاری۔ خرم ٹھیک ہوا تو کچھ کچھ اس کی طرف متوجہ ہو چلا تھا کہ اچانک ایک بار پھر مائرہ سامنے آئی تو وہ اپنے دل میں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ایک بار پھر بیٹھا بیٹھا درد محسوس کرنے لگا تھا۔

رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ خرم سوچے جا رہا تھا اور عریبہ خاموشی سے لیٹی اس کی بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔ یہ سب اب اس کی برداشت سے باہر ہو چلا تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے خرم؟ آج آپ بہت پریشان سے لگ رہے ہیں۔" اس نے محبت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

"کوئی بات نہیں' بس نیند نہیں آ رہی تھی۔" خرم نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا پھر وہ لیٹنے کے لیے بیڈ پر آ گیا۔ عریبہ بھی خاموشی سے لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ان دنوں خرم ایک بار پھر مائرہ کے سحر میں کھو گیا تھا۔ وہ گھر بھی کافی لیٹ آنے لگا تھا۔ عریبہ محسوس کر رہی تھی' وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی اس سے دور ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر اس سے الجھ پڑتا مگر وہ بڑی خنداں پیشانی سے اس کے ہر سلوک کو برداشت کر رہی تھی۔ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی' جو اس کا اپنا تھا وہ دوسری عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے مگر اپنی محبت میں کسی کو حصے دار بننا نہیں چاہتی۔ خرم کی مصروفیت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اب وہ روز کوئی نہ کوئی بہانا بنانے لگا تھا۔ آج میٹنگ تھی' آج فلاں جگہ جانا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ عریبہ اس قسم کے بہانے سننے کی عادی ہو چلی تھی۔ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھ رہی تھی' محسوس کر رہی تھی۔ وہ کئی بار خرم کی گفتگو مائرہ کے ساتھ فون پر سن چکی تھی۔ اب اسے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ خرم شادی سے پہلے مائرہ کو پسند کرتا تھا بلکہ اب بھی کرتا ہے مگر اتنا کچھ جان لینے کے باوجود اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کبھی بھی خرم سے مائرہ کے بارے میں سوال نہیں کیا' کوئی شکوہ لبوں پر نہیں آیا تھا۔ وہ تو ویسے ہی وفا پرست بیوی کی طرح چپ چاپ اس سے محبت کیے جا رہی تھی اور خرم اس سے اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔

اس شام گھر میں بڑا فنکشن تھا۔ بیگم سجاد نے بہت بڑے پیمانے پر یہ فنکشن کیا تھا۔ گل ہاؤس میں ایسے کئی فنکشن ہو چکے تھے مگر آج کے فنکشن کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ فنکشن خرم کی صحت یابی کی خوشی میں تھا۔ عریبہ نے آج میلاد کی منت بھی پوری کی' کافی خواتین میلاد شریف میں شریک ہوئیں اور بہت سارے مہمان شام ڈنر پر آئے۔ آنے والوں میں مائرہ بھی شامل تھی۔ آج خرم ہمیشہ سے زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔ مائرہ بڑی بے باکی سے اس کے ساتھ چپک رہی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر بیگم سجاد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا مگر وہ مہمانوں کی موجودگی میں خرم کو کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں۔ اپنے غصے کو قابو کیے ہوئے تھیں اور عریبہ سوگوار سی مہمانوں کے ساتھ بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ تبھی اس کے قریب بیٹھی نائلہ نے کہا۔

"عریبہ' تم کیسی عورت ہو' خرم کو کنٹرول کرو ورنہ ایک دن پچھتاؤ گی' تمہاری یہ خاموشی خرم کے حوصلے بڑھا رہی ہے کہ آج وہ یوں سرعام مائرہ سے اتنا بے تکلف نظر آ رہا ہے۔ اسے تمہارے جذبوں کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

"بڑی بھابی! مجھے اپنی وفا' اپنی محبت پر یقین ہے۔ خرم میرا دامن چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔" عریبہ نے بہت اطمینان سے کہا۔

"نہیں عریبہ' تم غلطی پر ہو۔ کبھی کبھی یقین اس طرح ٹوٹتا ہے کہ دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ابھی وقت

ہے' تم اس کی بیوی ہو۔"

"بیوی کا رشتہ' یہ بندھن جتنا مضبوط نظر آتا ہے اتنا ہی کمزور بھی ہوتا ہے' کچے دھاگے کی طرح۔" فوزیہ نے بھی بڑی بھابی کی بات کی ہاں میں ہاں ملائی' وہ بولی۔

"نہیں فوزیہ' میرا خیال ہے اگر مرد کو پتا چل جائے کہ بیوی اس کی خفیہ باتوں سے واقف ہو چکی ہے تو وہ اور بھی باغی ہو جاتا ہے اور پھر وہ کھل کر سب کچھ کہہ ڈالتا ہے' پھر بتاؤ عورت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ابھی خرم نے مجھ سے کوئی اس قسم کی بات نہیں کی جو بھرم ہمارے درمیان قائم ہے وہ قائم رہنے دو اگر یہ بھرم بھی ٹوٹ گیا تو پھر کچھ نہ بچے گا۔ سب کچھ جل جائے گا اور راکھ رہ جائے گی۔"

"تمہیں تو فلسفہ بگھارنا آتا ہے' تمہاری منطق میری سمجھ سے باہر ہے' بہت حوصلہ ہے تم میں۔" فوزیہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی' وہ بھی مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

کافی رات گئے یہ تقریب ختم ہوئی۔ مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ خرم بھی مائرہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

خرم' مائرہ کو ڈراپ کر کے گل ہاؤس آیا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ بیگم سجاد برآمدے میں بیٹھی اس کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ خرم تیزی سے اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ ان کی پاٹ دار آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"خرم! ادھر آؤ۔" بیگم سجاد کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم رک گئے' وہ ان کی طرف گھوما۔

"جی امی جان۔"

"یہ سب میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ تم مائرہ میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہو۔" انہوں نے گھورتے ہوئے کہا۔

"امی جان' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کا وہم ہے۔" خرم نے صاف جھوٹ بولا۔ بیگم سجاد گرجیں۔

"جھوٹ بولتے ہو' میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ خرم! کان کھول کر سن لو' آئندہ تم مائرہ سے نہیں ملو گے اور اگر تم اب بھی باز نہیں آئے تو میں کوئی بڑا قدم اٹھاؤں گی۔"

"امی جان! آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہیں' میں نے کہا نا کہ....."

"بس اب زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے' مجھے سب پتا ہے۔" بیگم سجاد نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "ایک وفا پرست بیوی کو نظر انداز کر کے دوسری عورت کے پیچھے بھاگنا شریف لوگوں کا شیوہ نہیں۔"

خرم ایک لمحے کو خاموش کھڑا رہا پھر بولا "امی جان' میرے خیال میں جب آپ سب کچھ سمجھ چکی ہیں تو میں بھی آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میری شادی آپ نے عریبہ سے اپنی مرضی سے کی میری کوئی مرضی نہیں تھی' میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب مائرہ واپس آ گئی ہے' میں مائرہ کو کل بھی پسند کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔ اگلے ہفتے ہم دونوں کورٹ میرج کر رہے ہیں۔" خرم نے اپنا فیصلہ سنایا تو دروازے کے پاس کھڑی عریبہ لرز کر رہ گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تو عریبہ تمہاری ساری محبتیں' ساری وفائیں سب رائیگاں ہو گئیں۔ اس ستمگر کو تمہارا ذرا بھی احساس نہیں۔ تم نے تو خاموشی کی مہر لگا کر سوچا تھا کہ تم اپنے آشیانے کو تباہی سے بچالو گی۔

"خرم! کان کھول کر سن لو اگر تم نے مائرہ سے شادی کی تو میں تمہیں عاق کردوں گی۔" بیگم سجاد کی گرج دار آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونک گئی تب ہی خرم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تو امی جان رکھیے اپنی عریبہ بیگم کو میں جارہا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت طلاق کے کاغذات میں رجسٹری سے بھیج دوں گا۔" عریبہ تیزی سے کمرے سے باہر آگئی۔

"نہیں نہیں خرم' خدا کے واسطے یہ ظلم تو نہ کرنا۔ تم مائرہ سے شادی کرنا چاہتے' ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کر لو مگر طلاق کا لفظ اب زبان پر نہ لانا۔" بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ گھر کے تقریباً سبھی لوگ ادھر ہی آگئے تھے۔ بڑی بھابی' فیروز وغیرہ۔

"عریبہ پاگل ہو گئی ہو۔" بیگم سجاد نے غصے سے کہا' وہ بولی۔

"نہیں امی جان' میں خرم کی خوشی میں خوش ہوں' مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔" وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ خرم بھی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"کہاں جارہے ہو خرم؟" فیروز نے ڈانٹ کر اسے پکارا۔

"بس بھائی جان' امی مجھے عاق کرنا چاہتی ہیں تو کردیں میں مائرہ سے شادی ضرور کروں گا۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

عریبہ نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا' خرم نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے گاڑی چلا دی۔

گیا جیسے جھونکا ہوا کا ہماری خوشی کا زمانہ
دیے ہم سفر نے وہ آنسو تب آیا ہمیں مسکرانا

گیت کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی' اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگنے لگے گیت کتنے سچے ہوتے ہیں' ہمارے احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔

وہ دیکھو جلا گھر کسی کا یہ ٹوٹے ہیں کس کے ستارے
کہ قسمت ہنسی اور ایسے ہنسی کہ رونے لگے غم کے مارے
وہ دیکھو جلا گھر کسی کا.....

فوزیہ اس کے دل کی تباہی سے بے خبر' اتنی رات گئے بھی اونچی آواز میں ٹیپ سن رہی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر وہ رات گئے تک ٹیپ ضرور سنتی تھی۔ عریبہ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں' وہ روتی رہی اپنی تباہی پر' ماتم کرتی رہی اور رات گزرتی رہی۔

بیگم سجاد اپنے کمرے میں بے چین تھیں۔ انہیں خرم سے اس نافرمانی کی امید نہیں تھی۔ انہیں تو اپنی تربیت پر بڑا مان تھا۔ انہوں نے بچوں کی پرورش بڑی توجہ سے کی تھی۔ سجاد احمد کے انتقال کے بعد انہوں نے بچوں کو باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی۔ سجاد احمد کے بزنس کو انہوں نے ان کے انتقال کے بعد خود

ڈیل کیا تھا' بعد میں انہوں نے فیروز کے سپرد اس بزنس کو کردیا تھا جسے فیروز بڑی خوبی سے چلا رہے تھے۔ وقار اور زبیر باہر سیٹل ہو گئے تھے' سالانہ چھٹیوں پر آتے تھے' بہوئیں سب بیگم سجاد کے ساتھ ہی گل ہاؤس میں رہتی تھیں۔ بیگم سجاد نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کی اولادوں میں ایک اولاد اتنی نافرمان نکلے گی اور خرم کو تو وہ بہت چاہتی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچے جارہی تھیں۔

کئی دن گزر گئے تھے۔ خرم پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ بیگم سجاد بہت پریشان تھیں' گل ہاؤس میں ان دنوں بڑی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سبھی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ فوزیہ کے کمرے سے ٹیپ کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

شام گہری ہورہی تھی' ملگجا سا اندھیرا کمرے میں پھیلا ہوا تھا' بالکل اس کے مقدر کی طرح۔ وہ سوچوں میں گم تھی' اس نے ایک بار پھر وقت اور حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ بھائیوں کے سر پر وہ بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کا کوئی مقام نہیں ہے' اس نے یہی سوچا کہ خرم کو شادی کی اجازت دے کر وہ اپنا یہ سائبان بچاسکتی تھی اگر خرم نے طلاق دے دی تو وہ کہاں جائے گی؟ وہ بہت دیر سے بیٹھی سوچے جارہی تھی تبھی فون کی بیل بج اٹھی۔ اس نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو' ہیلو' یہ خرم علی کا گھر ہے؟" دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں' یہ خرم علی کا گھر ہے اور میں ان کی وائف بات کررہی ہوں۔" عریبہ نے بتایا۔

"عریبہ بھابی! میں خرم کا دوست ڈاکٹر شہاب بات کررہا ہوں' کل رات خرم کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ خرم بہت زیادہ زخمی ہو گئے ہیں۔ میں اسپتال سے بات کررہا ہوں۔"

ریسیور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا گھبراہٹ میں اس کی چیخ نکل گئی۔ بڑی بھابی' فوزیہ' بیگم سجاد اس کی آواز سن کر تیزی سے اس کے کمرے میں آگئیں۔

"کیا ہوا عریبہ بیٹی؟ کس کا فون تھا؟" انہوں نے ریسیور نیچے گرا دیکھ کر پوچھا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"مجھے ہول آرہا ہے بیٹا کچھ تو بولو۔"

"عریبہ' کس کا فون تھا؟" بڑی بھابی نے پوچھا۔

"بھابی! خرم اسپتال میں ہیں' ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' ان کے دوست ڈاکٹر شہاب کا فون تھا۔"

بیگم سجاد شدت غم سے نڈھال سی بیڈ پر بیٹھ گئیں پھر بولیں "فوزیہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔"

وہ لوگ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر شہاب نے بتایا کہ خرم کی ٹانگ بہت زیادہ زخمی ہو گئی تھی۔ آپریشن ہوا ہے خرم کو ابھی ہوش نہیں آرہا ہے۔

"اف میرے خدایا' اتنا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" بیگم سجاد نے بے چینی سے کہا پھر ڈاکٹر شہاب بولے۔

"میں نے مائرہ کو بھی اطلاع کردی ہے۔"

"اس منحوس کا نام نہ لو بیٹا' تم نے اسے کیوں اطلاع دی؟ اسی نے تو آکر ہم سب کی زندگی میں زہر گھولا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے۔"

"مگر خرم نے آپریشن روم میں جاتے ہوئے مجھے تاکید کی تھی کہ میں انہیں اطلاع کردوں۔" یہ بتا کر ڈاکٹر شہاب آپریشن روم کی طرف چلے گئے۔

مائرہ بھی اطلاع ملتے ہی اسپتال پہنچ گئی تھی۔ بیگم سجاد نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"خرم کہاں ہیں؟" مائرہ نے فوزیہ سے پوچھا۔

"آپریشن روم میں۔" فوزیہ نے اسے بتایا۔ عریبہ خاموش کھڑی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر شہاب نے آکر کہا "اب آپ لوگ خرم سے مل سکتے ہیں۔" عریبہ بے چینی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی' اس کے پیچھے گھر کے سبھی افراد' بڑی بھابی' بیگم سجاد اور فوزیہ وغیرہ کمرے میں داخل ہوئے۔ مائرہ بھی اس کے نزدیک آکر رک گئی۔ اسے دیکھ کر خرم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خرم! یہ سب کیسے ہوگیا؟"

خرم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر شہاب بولے "مجھے افسوس کے ساتھ یہ بات بتانی پڑ رہی ہے کہ ہمیں خرم کی ایک ٹانگ گھٹنے سے کاٹنی پڑی' ٹانگ بری طرح کچل گئی تھی۔ آپریشن تو کل رات ہی ہوگیا تھا مگر ہوش انہیں اب آیا ہے۔"

عریبہ کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی۔ بیگم سجاد غم سے نڈھال ہوگئی تھیں۔ خرم کی بھابیاں' بھائی سبھی اس خبر سے ہراساں ہوگئے تھے۔ بیگم سجاد زاروقطار رو رہی تھیں "میرے بچے کو کس کی نظر لگ گئی۔"

"مائرہ! اب میں اپاہج ہوگیا ہوں۔" مائرہ کچھ نہ بولی کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا' میں معذور ہوگیا ہوں۔" خرم نے بڑے کرب سے دہرایا۔ تبھی عریبہ بولی۔

"نہیں نہیں خرم' آپ ایسا نہ سوچیں' میں آپ کا سہارا بنوں گی۔ مجھے اپنا سہاگ ہر حال میں عزیز ہے۔" اس نے خرم کے مضبوط ہاتھ پر اپنا نازک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ' میں تمہارا محتاج بننا نہیں چاہوں گا۔" پھر وہ مائرہ سے مخاطب ہوا "سنا مائرہ تم نے' عریبہ سمجھ رہی ہے میں اپاہج ہوگیا ہوں تو اس کی طرف لوٹ آؤں گا۔ شاید اسے یہ نہیں پتا صرف چار دن بعد ہم دونوں کورٹ میرج کرنے والے ہیں۔ سارے انتظامات تو مکمل ہوگئے ہیں اور عریبہ بیگم تم تو مجھے اجازت بھی دے چکی ہو' تمہارے لیے یہی بہت ہے کہ خرم علی کا لیبل لگائے گل ہاؤس کے ایک کونے میں پڑی رہو۔ گل ہاؤس میں ویسے بھی بہت گنجائش ہے۔"

بیگم سجاد سے اس کی جلی کٹی گفتگو نہ سنی گئی' وہ خرم کو گھورتے ہوئے کمرے سے باہر آگئیں۔ مائرہ نے کچھ دیر خرم کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑی رہی پھر بولی۔

"خرم! مجھے افسوس ہے کہ اب تم اپنے پیروں پر نہ چل سکو گے۔ میں معذرت خواہ ہوں' مجھے معاف کردینا' میں اس موڑ پر تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی کیونکہ میں اپنی سوسائٹی میں تماشا بننا نہیں چاہتی۔"

مائرہ کے الفاظ کسی نشتر سے کم نہ تھے۔ مائرہ اتنا کہہ کر تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ فوزیہ اور بڑی بھابی بھی باہر آگئی تھیں۔ اب کمرے میں خرم اور عریبہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ خرم کے چہرے پر دکھ کی

پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ عریبہ نے ایک بار پھر اس کے مضبوط ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور سسک پڑی۔

دوسرے لمحے خرم بیڈ سے اچھل کر اس کے بالکل روبرو کھڑا تھا' اپنی دونوں ٹانگوں پر۔ عریبہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

خرم نے اسے شانوں سے تھامتے ہوئے کہا "عریبہ! تمہاری وفا' تمہاری محبت جیت گئی' میں ہی پاگل تھا جو مسلسل سراب کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اچانک کل شام نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے سوچا کیوں نہ میں تم دونوں کی محبت کو آزماؤں۔ یہ سوچ کر میں نے ساری صورت حال شہاب کو بتائی' اس ڈرامے میں ڈاکٹر شہاب نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔ یہ ایکسیڈنٹ وغیرہ سب ایک ڈراما تھا ایک بار مائرہ مجھے ایسے ہی ایک موڑ پر چھوڑ چکی تھی مگر میں اس کی محبت میں پاگل ہوگیا۔ ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوبارہ اس کے فریب میں آگیا مگر نہ جانے اس رات امی جان کی باتوں اور تمہارے آنسوؤں نے کیا اثر دکھایا کہ میں تین دن تک الجھن کا شکار رہا اور پھر میں نے سوچ لیا' میں اس بار تم دونوں عورتوں کو آزماؤں گا۔ عریبہ جانی' تم اپنی وفاؤں کی بازی جیت گئی ہو۔ تم نے اپنی محبت' اپنی وفا سے اور اپنی عقل کے سمجھوتے سے خرم علی کو ہمیشہ کے لیے اپنا اسیر بنالیا ہے۔ بندہ اپنی چاہتوں' اپنی محبتوں سمیت تمہارے سامنے موجود ہے اب جو چاہے سزا دو۔" خرم نے پر شوخ لہجے میں اپنے سر کو اس کے آگے خم کرتے ہوئے کہا۔

عریبہ کے دل میں شادمانی کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ دل کے موسم پر اچانک بہار آگئی تھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

○☆○

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تمہیں جیت کر ہارے

تم نے پھر یہ شرٹ پہن لی۔" عا صمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اس کی طرف گھوما۔

"کیوں کیا برائی ہے' اس شرٹ میں...."

وہ طنزاً مسکرائی "ہاں جس تحفے سے یادیں وابستہ ہوں' اس میں برائی کہاں نظر آئے گی۔ تم مردوں کی فطرت کو دنیا کی کوئی عورت بدل نہیں سکتی۔"

"پلیز عا صمہ' صبح ہی صبح فضول باتیں نہ کرو تو بہتر ہے۔" شیراز نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"بہت ہو چکا شیراز حسن' میرے حوصلے کو نہ آزماؤ۔ اس منحوس ماہا کے گفٹ میرے اندر آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ تم اس کے گفٹ کیوں سنبھال سنبھال کر رکھتے ہو اور یہ شرٹ اس نے ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر دی تھی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں' آج ہماری شادی کو مگر پھر بھی تم یہ شرٹ اب تک پہنتے ہو۔ مجھے جلانے کے لیے۔ آگ لگا دوں گی' میں اس شرٹ کو آج...." اس کے لہجے میں بے اختیار تلخی گھلی ہوئی تھی۔

شیراز کمرے سے باہر آگیا۔ باہر اماں بیٹے بہو کی آوازیں سن کر اندازہ لگا چکی تھیں کہ ان میں پھر سے جھگڑا ہو رہا ہے "حد ہوتی ہے اماں' آپ کی بہو ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے۔" ماں کو متوجہ دیکھ کر شیراز نے جھنجلا کر کہا۔

"پھپھو جان' ان سے کہیں آج یہ شرٹ اتار دیں ورنہ میں آگ لگا دوں گی' نہ صرف اس شرٹ کو بلکہ اس کے دیے تمام تحفوں کو۔" عا صمہ بھی تیز لہجے میں بولتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔

"عا صمہ بیٹی' اتنی سی بات کو مسئلہ نہ بناؤ۔" اماں جو اس کی سگی پھپھو بھی تھیں' اسے سمجھاتے ہوئے بولیں تو وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اماں بیٹے سے مخاطب ہوئیں "شیراز بیٹا' دوسری شرٹ بدل لو' اس

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

پینٹ پر تو یہ مناسب بھی نہیں لگ رہی ہے۔"

"اماں بس رہنے دیں' آپ نے ہی اسے سر چڑھایا ہوا ہے۔ ہمیشہ اسی کا ساتھ دیتی ہیں۔" شیراز کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

عامہ پر عجیب دیوانگی طاری تھی۔ وہ شیراز کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھی اور شرٹ کھینچ کر سائڈ سے پھاڑتی چلی گئی۔ رقابت کی آگ اس کے اندر اتنی دہک رہی تھی کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں تھی۔

"اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ تم اسے دوبارہ پہن کر میرے دل پر زخم لگاؤ' میں ایک ایک گفٹ جلا دوں گی۔ اس کی یادیں تمہارے ذہن سے کھرچ کر نہ پھینک دوں تو میرا نام عامہ نہیں۔" وہ نہ جانے کیا کیا بکتی جا رہی تھی کہ شیراز کا ہاتھ اٹھا اور اس کے رخسار پر پڑ گیا۔

"عامہ بیگم' اپنی اوقات میں رہو۔" اس نے اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے غصے سے کہا۔

عامہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہ تھی۔ شیراز کے بھرپور تھپڑ نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ غم و غصے کی کیفیت میں بیڈ پر بیٹھی سسک رہی تھی۔

شیراز نے وہ شرٹ اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ الماری سے دوسری شرٹ نکال کر پہن لی۔ آفس کے لیے دیر پہلے ہی ہو گئی تھی۔

جاتے ہوئے اس نے اماں کو خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ اماں ہونقوں کی طرح اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں اور وہ بائیک پر بیٹھ کر چلا بھی گیا۔ اماں کچھ سوچ کر عامہ کے کمرے میں آ گئیں "عامہ بیٹا کیا ہوا؟"

"پھپھو جان' آپ کہتی تھیں' وہ ماہا کو بھول جائیں گے مگر آپ نے دیکھا' ان پانچ سالوں میں ذرا بھی تو فرق نہیں آیا ہے۔ آج اسی منحوس کی وجہ سے مجھے تھپڑ مارا ہے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"کیا شیراز نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"عامہ بیٹا' میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ اس موضوع پر شیراز سے مت الجھا کرو۔ کبھی کبھی ذرا سی بات سے بات بہت بڑھ جاتی ہے۔"

"یہ ذرا سی بات نہیں ہے پھپھو جان!" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"ہمیشہ فساد اسی کی وجہ سے شروع ہوتا ہے۔ ہمیشہ میں درگزر کر دیتی ہوں۔"

"بیٹا' درگزر کر دینا ہی عورت کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"

انہوں نے سمجھانا چاہا "اٹھو چل کر میرے ساتھ ناشتا کرو۔" شیراز بھی بغیر ناشتے کے چلا گیا۔

"جائیں پھپھو جان' مجھے رہنے دیں۔ نہیں چاہیے' مجھے کسی کی بھی ہمدردی۔" وہ جھنجلا کر بولی تو وہ خاموشی سے باہر آ گئیں۔

ماسی برآمدے کی جھاڑو دے رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی "عامہ بی بی نظر نہیں آ رہیں۔"

"ہاں شکورن! عامہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے کمرے کی ڈسٹنگ رہنے دو۔ ابھی آرام کر رہی ہے۔" انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔

"کیا طبیعت خراب ہے عامہ بی بی کی! میں ذرا خیر خیریت تو معلوم کر لوں۔" شکورن پرانی ملازمہ تھی اور

عامہ اس کا خیال بھی بہت رکھتی تھی۔ وہ اس کی طبیعت کا سن کر فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"رہنے دو۔ وہ سو رہی ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا تو شکورن کے بڑھتے قدم رک گئے۔

"بیگم صاحب جی' کل مجھے بھی بڑا تیز بخار تھا۔ گولیاں کھا کھا کر حلق کڑوا ہو گیا تھا...." شکورن جانے کیا کیا بولتی رہی۔ اماں تو اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ انہیں شیراز پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا "اپنے ہوش میں نہیں رہتا یہ لڑکا۔ غلطی سراسر شیراز کی ہی ہے۔ وہ منحوس اب تک اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی ہے۔ شادی کو پانچ سال ہو گئے۔ کم بخت نے پیچھا نہیں چھوڑا۔"

"اچھا بیگم صاحب جی' میں تو چلتی ہوں۔" شکورن نے کچن کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر کہا تو وہ بری طرح چونک گئیں۔

"ارے شکورن! دیکھ فریج میں رات کا سالن رکھا ہے۔ تیرے لیے رکھا تھا عامہ نے۔ وہ لیتی جا تھیلی میں ڈال کے۔" شکورن نے فریج کھولا اور سالن تھیلی میں ڈالنے لگی۔

"شکورن' تم کب آئیں؟" عامہ کی آواز پر شکورن نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

"عامہ بی بی' ایک گھنٹا ہو گیا۔ سب کام نمٹا دیے ہیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔" وہ شروع ہو گئی "کچھ نہیں۔ بس سر میں درد تھا۔" عامہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا پھر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

شکورن جا چکی تھی۔ عامہ کافی دیر سے کچن میں تھی۔ ساس مطمئن بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں کہ ان کی ناک میں کچھ جلنے کی بو آئی "عامہ کیا چولہے پر کچھ رکھا ہے۔ جلنے کی بو آ رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے خود اٹھ کر کچن میں آ گئیں۔

"یہ کیا غضب کر رہی ہو عامہ!"

اس نے مڑ کر ساس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ کچن میں دھواں بھر رہا تھا۔

"پھپھو جان' میں نے اس منحوس کے سارے گفٹ جلا دیے ہیں۔ اس کی ساری یادگاروں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا ہے۔" وہ بڑے جوش میں بول رہی تھی۔

"بیٹا عامہ' یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس عمل سے بات بڑھ سکتی ہے۔"

وہ ہاتھ مل رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ساس نے اسے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا' خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

شیراز آفس میں اکیلا بیٹھا صبح کے واقعے پر شرمسار ہو رہا تھا۔ شادی کے پانچ سالوں میں وہ پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا۔ عامہ اس کی پسند نہیں تھی مگر شادی کے بعد اس نے کبھی اسے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا' تاہم عامہ اکثر اس سے الجھ جایا کرتی تھی مگر آج تو اس کے اندر ہی اندر پکتا ہوا لاوا پھٹ پڑا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں رہی تھی۔ کیسی دیوانگی چھائی تھی اس پر۔ شرٹ کو ہی پھاڑ ڈالا' جبھی تو شیراز کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

"عامہ بیگم! تم کیا جانو' محبت کیا ہوتی ہے۔ ماہا کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اس نے تو اپنی محبت کو امر کر دیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

.... ان دنوں وہ جاب کے چکر میں خوار ہوتا پھر رہا تھا۔ ماہا سے پہلی ملاقات بھی ایک اتفاق تھی۔ اس دن صبح سے بدلی چھائی ہوئی تھی۔ گھر سے ابھی وہ نکلا ہی تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ وہ انٹرویو دینے پہنچا تو اس کا حلیہ بارش کی وجہ سے خاصا بگڑا ہوا تھا۔ لیٹ بھی ہوگیا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" نسوانی آواز پر وہ چونکا۔ اس نے سامنے کھڑی لڑکی پر ایک نظر ڈالی جو اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ لڑکی خاصی خوش شکل تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے حسن کو دوبالا کردیا تھا "میں نے آپ سے پوچھا تھا' کس سے ملنا ہے؟" لڑکی نے دوبارہ کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

"مجھے ذاکر صاحب نے بھیجا ہے اور مجھے ہمدانی صاحب سے ملنا ہے۔ جاب کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے آیا ہوں۔" اس نے تفصیلی جواب دیا تو لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایک دم گہری ہوگئی۔

"مسٹر' آپ بہت لیٹ آئے ہیں اور انٹرویو کا وقت بھی ختم ہوچکا ہے۔ ہمدانی صاحب جاچکے ہیں۔" لڑکی نے روکھے سے لہجے میں بتایا۔

"بارش کی وجہ سے میری بائیک خراب ہوگئی تھی۔ اس بارش نے میرا حلیہ بھی خاصا بگاڑ دیا ہے۔" اس نے اپنے بھیگے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بالوں سے بھی پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

"سوری' میں نے آپ کو بتایا نا کہ ہمدانی صاحب جاچکے ہیں۔" اس نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔

اس نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور تھکے تھکے انداز میں گیٹ کی طرف مڑا "ایکسکیوزمی!" لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔

"جی فرمایئے۔" لہجے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"ڈاکومنٹ لائے ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کیا آپ اچار ڈالیں گی ان کا؟" اس لڑکی کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی "سیٹ تو آپ لوگ پہلے ہی بک کرلیتے ہیں۔ انٹرویو کا ایڈ دے کر آپ لوگ ضرورت مندوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بس رسم نبھانی ہوتی ہے آپ لوگوں کو۔" وہ بے حد جلے ہوئے انداز میں بولا۔

"آپ کا خیال ہمارے ادارے کے بارے میں غلط ہے۔ ہمارے یہاں کوئی سفارش نہیں چلتی' ضرورت مند کی قابلیت پر ہی انتخاب ہوتا ہے اور آپ خوش قسمت ہیں کہ انٹرویو تو ضرور ہوئے ہیں لیکن ابھی تک وہ سیٹ خالی ہے جس کے لیے آپ آئے ہیں۔ ابھی انتخاب باقی ہے۔ لایئے' اپنے ڈاکومنٹ مجھے دے دیجیے۔ میں ہمدانی صاحب تک پہنچادوں گی اور آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ ذاکر صاحب نے آپ کو بھیجا ہے اس لیے میں ایسا کررہی ہوں۔"

شیراز کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ امید کی ایک کرن کا سہارا لے کر اس نے اپنے ڈاکومنٹ اس کی طرف بڑھادیے۔

وہ فائل لے کر اپنے روم کی طرف بڑھی "ایکسکیوزمی مس' آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"ماہا۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا اور اندر روم میں چلی گئی۔

"یقیناً یہ ہمدانی صاحب کی سیکریٹری ہوگی۔" وہ سوچتا ہوا واپسی کے لیے پلٹا۔

پورا مہینہ گزر گیا' نہ کوئی فون آیا نہ کوئی اپائنٹمنٹ لیٹر۔ ان دنوں وہ جاب کے سلسلے میں خوار ہورہا تھا۔ سی ایس ایس کرکے بھی بے روزگار تھا۔ اسے اپنی قابلیت کے مطابق جاب نہیں مل رہی تھی۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ باپ کے انتقال کو چند سال ہوئے تھے۔ دو بڑی اور ایک چھوٹی بہن کی شادیاں باپ نے اپنی زندگی میں ہی کردی تھیں۔ اب ایک چھوٹی بہن نگہت تھی۔ رہائش کے لیے گھر اپنا تھا۔ ایک سو بیس گز پر بنا ہوا گلبرگ میں دو منزلہ مکان تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اماں نے اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا تھا۔

باپ نیم سرکاری دفتر میں اچھے عہدے پر فائز تھے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ باپ نے شیراز کو اس قابل بنادیا تھا کہ اس کا مستقبل روشن تھا مگر روز روز کی ناکامی نے اسے الجھا دیا تھا۔ ڈگری حاصل کرلینے کے بعد بھی جاب کے لیے سرتوڑ کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ تھکا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اماں ہمیشہ کی طرح برآمدے ہی میں مل گئیں "لو بھئی' لگتا ہے' تمہارے لیے اپائنٹمنٹ لیٹر آگیا ہے۔" انہوں نے وہ لفافہ اس کی طرف بڑھایا جو پوسٹ مین کچھ دیر پہلے دے کر گیا تھا۔ وہ وہیں بچھے تخت پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"اماں' یہ تو ہمدانی صاحب کی طرف سے اپائنٹمنٹ لیٹر آیا ہے۔"

"بھائی چائے۔" نگہت چائے ادھر ہی لے آئی۔

"ایک منٹ نگہت' میں منہ تو دھولوں۔" وہ کہتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے نگہت کی طرف دیکھا اور بولا "اماں بس اب مجھے جاب مل گئی ہے' نگہت کو رخصت کرنے کی تیاری کریں۔"

"ارے ہاں بیٹا' تمہارے ماموں ممانی بھی آئے تھے۔ امجد تعلیم مکمل کرکے آرہا ہے۔ کہہ گئے ہیں' نگہت کو رخصت کرنے کی تیاری کرلیں۔"

"آئی سی اماں' جبھی نگہت بڑی کھلی ہوئی نظر آرہی ہے۔" شیراز نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو نگہت جھینپ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ خوش دلی سے مسکرادیا۔

آج آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ اکاؤنٹنٹ کے لیے اس کا انتخاب ہوا تھا۔ سارا دن گزر گیا۔ اسے وہ لڑکی ماہا نظر نہیں آئی تھی۔ کسی سے اس نے معلوم بھی نہیں کیا۔ دراصل وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ یہ جاب اسی کی مہربانی سے ہی ملی تھی۔ اگر اس دن وہ اس کے ڈاکومنٹ نہ لیتی تو شاید.... وہ یہاں نہ ہوتا۔ شام کو وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ہمدانی صاحب نے اسے اپنے آفس میں بلالیا۔

"مے آئی کم ان سر۔"

"آؤ آؤ بھئی' شیراز حسن' بیٹھو۔" ہمدانی صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر بولے "میں نے سب سے تو تمہارا تعارف کرادیا ہے' ان سے ملو' یہ میری اکلوتی بیٹی ماہا ہیں۔ انہوں نے ہی آپ کو اس سیٹ کے لیے منتخب کیا ہے۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وہ چونکا "تو ماہا ہمدانی صاحب کی بیٹی ہے!" پھر بولا "ماہا صاحبہ بہت شکریہ کہ آپ نے میرا انتخاب کیا۔۔۔"
وہ صرف ہولے سے مسکرائی۔
ہمدانی صاحب نے کہا "شیراز حسن' یہ آپ کی قسمت ہے کہ اس دن آپ آگئے۔ اتفاق ہے کہ اس دن جتنے انٹرویو کیے' ماہا کے کوئی بھی معیار پر پورا نہیں اترا۔ ماہا نے پچھلے سال امریکا سے ایم بی اے کیا ہے اور میرے بعد میرا بزنس اسی کو سنبھالنا ہے۔ اسی لیے میں نے سارے اختیارات بھی ماہا کو دے دیے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ بزنس کو کس طرح ڈیل کرتی ہیں۔" وہ ماہا کو دیکھ کر بولے پھر شیراز کی طرف دیکھنے لگے۔
"اوکے شیراز حسن' امید ہے' آپ ہمارے بزنس کو سمجھ گئے ہوں گے اور اپنی ذمے داریوں کو بھی۔"
"جی بہتر' آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" وہ رخصت ہو کر گھر آگیا۔
وہ پہلی نظر کی محبت کا قائل تو نہیں تھا مگر دل تھا کہ ماہا کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ان دنوں وہ محسوس کر رہا تھا کہ ماہا میں اس کی غیر معمولی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ماہا جو کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھی مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی محبت یک طرفہ ہے یا نہیں۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ کبھی محبت کا اظہار کرتا۔ وہ تو بڑی خاموشی سے محبت کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھا ماہا کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔
اور تبھی کچھ سوچتے ہوئے اس نے ماہا کا نمبر ڈائل کیا۔
"ہیلو۔" دوسری طرف ماہا تھی۔ اس کی آواز سن کر وہ گم سا ہو گیا۔
"ہیلو۔" دوسری بار کہا گیا تو وہ چونکا۔
"ہیلو میں شیراز۔۔۔"
"جی شیراز صاحب' اس وقت فون' وہ بھی گھر پر!" ماہا کے لہجے میں حیرانی تھی۔
وہ ہمت ہارنے لگا "پگلے جو کہنا ہے' کہہ ڈالو۔ یہ سوچے بغیر کے اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔" دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔ دل نے اسے اکسایا "پلیز شیراز صاحب' آپ خاموش کیوں ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟ بولتے کیوں نہیں۔"
"ماہا آپ جانتی ہیں' محبت کیا ہوتی ہے۔" الفاظ نہ جانے کیسے پھسلتے چلے گئے تھے۔
"یہ کیا حماقت ہے شیراز صاحب۔" ماہا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
وہ بولا "یہ حماقت اس محبت کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے جو مجھے آپ سے ہو گئی ہے۔" وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا' ماہا یقین و بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہی تھی "آپ فون بند نہیں کیجئے گا پلیز ماہا' کچھ تو کہیے۔" دوسری طرف کچھ دیر تو خاموشی چھائی رہی اور پھر ماہا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"کیسے کہوں' شیراز صاحب کہ سچے جذبوں کی خوشبو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔"
اس کے الفاظ تھے کہ اس کے دل میں جلترنگ بجا گئے۔
محبت اپنے فاصلے خود طے کرتی ہے۔ وہ دونوں اس اظہار کے بعد آنے والے لمحوں سے بے خبر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔

اس شام وہ گھر میں بڑا مسرور سا داخل ہوا۔ گنگناتا اور مسکراتا ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نگہت بولی "بھائی' آج ایک زبردست سرپرائز ہے آپ کے لیے۔"
"او مائی ڈیئر سسٹر' کیا تم نے سرپرائز دینے کا ٹھیکا لے لیا ہے۔ چکر کیا ہے۔ اب سنا بھی چکو۔" وہ خوش دلی سے بولا۔
"بھائی' امی اور ممانی کی دلی خواہش ہے کہ عاصمہ آپی دلہن بن کر اس میں گھر میں آئیں اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی یہی چاہتے ہیں۔ کیسا رہا سرپرائز۔" نگہت نے ہنستے ہوئے سوال کیا تو وہ بری طرح چونکا۔
"بیٹا' میری برسوں کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ عاصمہ جب پیدا ہوئی تھی تو میں نے اسے بہو بنانے کا سوچ لیا تھا مگر کبھی بھائی صاحب سے ذکر نہ کر سکی تھی۔ ایسی خواہش وقت سے پہلے کرنا فضول تھی اور اب جبکہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہو تو آج بھائی صاحب کے سامنے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو بھابی اور بھائی نے فوراً ہی اس رشتے کو منظور کر لیا ہے۔" اماں اس کی دلی کیفیت جانے بنا بولے جا رہی تھیں "بھابی جانتی ہیں کہ عاصمہ کا جھکاؤ شروع سے تمہاری طرف ہے پھر بھائی صاحب کی بھی یہی خواہش ہے کہ نگہت ان کے گھر چلی جائے اور عاصمہ تمہاری دلہن بن کر اس گھر میں آجائے گی تو ہم دونوں بھائی بہن کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔"
"نہیں نہیں' میں اپنے خوابوں کو بکھرنے نہیں دوں گا۔" وہ اندر ہی اندر چیخا اور کچھ کہے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
"اماں لگتا ہے' شیراز بھائی اس رشتے پر خوش نہیں ہیں۔" نگہت نے کہا۔
ماں بولیں "کیا برائی ہے عاصمہ میں اور ناخوش ہونے والی کون سی بات ہے۔ عاصمہ خوش شکل ہے' گھر کی لڑکی ہے' دیکھی بھالی ہے' بس ذرا مزاج کی تیز ہے۔ تو ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی تو ہوتی ہے۔"
"مگر اماں' بھائی کی رضامندی بھی تو ضروری ہے۔" نگہت نے کہا۔ اماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
صبح وہ آفس پہنچا تو بہت بجھا بجھا سا تھا۔
"کیا بات ہے' آج چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔" ماہا نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آسمانی کلر کے سادے سے سوٹ میں وہ بڑی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔
وہ کچھ نہ بولا۔ وہ بھی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی "کیا بات ہے شیراز' کچھ پریشان ہو؟"
"وہ ہمدانی صاحب نہیں' آئے۔" شیراز نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں' آج ڈیڈی نہیں آئیں گے۔"
"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟" شیراز نے غائب دماغی سے پوچھا۔
"میرے سوال کا جواب کیوں گول کر رہے ہو۔ بتاؤ نا' کیا پریشانی ہے؟" ماہا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
"ماہا' تم نے سوچا ہے' ہماری اس محبت کا انجام کیا ہو گا۔" شیراز نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"انجام بخیر ہوگا' یعنی خوشگوار۔" ماہا نے ہنستے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا پھر کچھ سوچ کر بولی "تمہیں آج صبح ہی صبح انجام کی فکر کیوں لاحق ہوگئی۔ ویسے شیراز' محبت کرنے والے انجام سے بے خبر محبت کے سمندر میں غوطہ لگا دیتے ہیں۔"

"یہی تو بھول ہوتی ہے۔" شیراز نے خلا میں گھورتے ہوئے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" ماہا نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

وہ کہنے لگا "ماہا' میں سوچتا ہوں' کہیں ہمدانی صاحب....."

"فضول پریشان نہ ہو شیراز' ڈیڈی میرے انتخاب پر خوش ہوں گے۔ میں اتنا بتا دوں شیراز کہ ڈیڈی ہماری اس چاہت سے بے خبر نہیں ہیں۔ تم اپنی کہو شیراز' میری طرف کے تو سارے راستے تمہاری سمت ہی آتے ہیں۔ صرف تمہاری طرف۔" ماہا نے جذب کے عالم میں اس سے کہا تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ماہا کے خوب صورت چہرے پر دھنک کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کافی دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر ایک دم وہ بولا "ماہا' امی نے میری بات میرے ماموں کی بیٹی عاصمہ سے طے کر دی ہے۔"

ایک لمحے میں ماہا کے چہرے پر اداسیاں سی پھیل گئیں "مگر تم انکار بھی تو کر سکتے ہو۔"

"ماہا' بہت مشکل ہے۔ میں ایک ایسے بھنور میں پھنس گیا ہوں' جس سے باہر نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا "ماہا بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری چھوٹی بہن نگہت کی بچپن میں ماموں کے بیٹے امجد سے منگنی ہوئی تھی۔ اگر میں انکار کرتا ہوں تو نگہت کا مسئلہ الجھ جائے گا۔ اماں عاصمہ کو لانے کے لیے بضد ہیں۔ اماں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اماں کہتی ہیں اگر میں نے انکار کیا تو نگہت کا رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نگہت نے بچپن سے امجد کے خواب دیکھے ہیں۔ میں اتنا خود غرض تو نہیں کہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے نگہت کے خوابوں کو توڑ ڈالوں۔"

"شیراز خون کے رشتے کبھی جدا نہیں رہ سکتے۔ رنجشیں ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گی مگر شیراز' ہم ایک بار بچھڑ گئے تو پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔" ماہا کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"ماہا' تم کیا سمجھ رہی ہو' میں تمہیں بھلا سکوں گا۔ کبھی بھی نہیں ماہا' کبھی بھی نہیں۔ نگہت درمیان میں نہ ہوتی تو ماہا میں صاف انکار کر دیتا مگر اب میں ایک ایسے موڑ پر ہوں کہ سوائے اپنی محبت کی قربانی کے میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے' ہم دونوں کو وقت اور حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔"

"شیراز اگر یہ تمہارا فیصلہ ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی اور اٹھ کر اپنے روم کی طرف چلی گئی۔

اس کا دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ نڈھال سی کرسی سے ٹیک لگائے سوچ رہی تھی "تو ماہا ہمدانی' تمہاری محبت کا ڈراپ سین ہو گیا۔ کیا تم شیراز کے بغیر جی سکو گی؟" محبت نے جتنی تیزی سے فاصلے طے کیے تھے' وہ اتنی ہی جلدی اس سے بچھڑ گئی تھی۔

اور پھر اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ وہ اسے بھول جائے۔ اس طرح کہ جیسے وہ اسے ملا ہی نہ تھا مگر اسے بھلانا اتنا آسان بھی نہیں تھا' جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی صحت کی طرف سے بے پروا ہو گئی تھی اور بیمار رہنے لگی تھی۔ محبت کی ناکامی نے اس سے زندگی کی امنگ چھین لی تھی۔ ہمدانی صاحب اپنی اکلوتی بیٹی سے پوچھ پوچھ کر تھک چکے تھے کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ وہ اداس رہنے لگی ہے۔

ایک شام جب وہ اپنے آفس میں بیٹھی تھی تو اس کے دل میں اچانک درد اٹھا اور وہ درد سے دہری ہو کر رہ گئی۔ شیراز اسی وقت فائل لے کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

"ماہا! تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔" وہ اس کی حالت دیکھ کر بے حد گھبرا گیا تھا۔ ابھی وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا کہ ماہا بے ہوش ہو گئی۔ وہ فون چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔ ماہا کو سنبھالتا ہوا وہ اپنے کولیگ کی گاڑی میں اسپتال پہنچا۔ ہمدانی صاحب بھی اطلاع ملنے پر فوراً اسپتال پہنچے۔ شیراز اتنے میں ڈاکٹر کو بلا لایا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد ان کو اطمینان دلایا کہ معمولی سا اٹیک تھا۔ شیراز کی آنکھیں غم اور دکھ سے لال ہو رہی تھیں۔ وہ ماہا کو بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور نظر نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر کی زبانی سن کر کہ ماہا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتا ہوا اسپتال میں ماہا کو ایمرجنسی وارڈ میں ہمدانی صاحب کے ہمراہ چھوڑ کر چلا آیا۔ اپنی محبت کے اس انجام کی اسے خبر نہ تھی۔ وہ خود کو گناہگار تصور کر رہا تھا۔ اس نے ایک جیتی جاگتی لڑکی کو زندگی سے دور کر دیا تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکا۔ محبت کے درد نے اسے سونے ہی نہ دیا۔ ہر سانس کے ساتھ اسے ماہا کی یاد آ رہی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ انسان مجبور کیسے ہوتا ہے۔ زندگی کیوں اتنی مشکل بن جاتی ہے۔ فیصلے کب اختیار میں نہیں رہتے ہیں "کیا میں ماہا کو دوبارہ زندگی نہیں دے سکتا؟" اس نے خود سے سوال کیا "کیا تم نگہت کو موت دے سکتے ہو؟" اس کے دل نے سوال پوچھا۔ وہ بولا "نہیں۔" "تو بس تم ماہا کو زندگی نہیں دے سکتے ہو۔" اپنے کٹھور فیصلے پر اسے جی بھر کر رونا آ رہا تھا۔ ماہا کی زندگی کی دعا مانگتے مانگتے نہ جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

ماہا کو اپنی بیماری کا علم تھا۔ وہ دل کی مریض تھی۔ وہ محبت کی مریض تھی اور محبت کا مرض لاعلاج ہوا کرتا ہے۔ اس کو ایک اٹیک ہو چکا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق دوسرا ہارٹ اٹیک جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ہمدانی صاحب اس کے علاج کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ملک کے مایہ ناز ہارٹ اسپیشلسٹ نے انہیں ماہا کا بائی پاس کروانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ماہا کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے اور ماہا کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ موت پہلے ملتی ہے یا بعد میں۔ اس نے خود کو وقت کے دھارے پر بہا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وقت کے دھارے پر تو شیراز بھی بہتا جا رہا تھا اور وقت کا کام ہے گزرنا۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا' بس گزرتا چلا جاتا ہے۔

شیراز کی شادی کو بھی ایک سال گزر گیا تھا۔ وہ عاصمہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ عاصمہ بھی جانتی تھی کہ یہ شادی اس کی مرضی سے نہیں ہوئی تھی۔ اماں کی خواہش اور نگہت کے لیے شیراز نے اپنے جذبوں کی قربانی دی تھی اور اس قربانی میں ماہا نے دل پر پتھر رکھ کر اس کا پورا ساتھ دیا تھا مگر عاصمہ' شیراز کی محبت حاصل کرنا چاہتی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھی۔ وہ زبان کی بہت تیز تھی۔ حد درجہ منہ پھٹ اور کسی حد تک بدتمیز۔ وہ شیراز کے دل سے ماہا کو نکال کر اس پر خود راج کرنا چاہتی تھی۔ ہر عورت کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا شوہر صرف اسی کا ہو۔ شیراز کو جب وہ ماہا کے خیالوں میں گم دیکھتی تو اس کو ماہا سے نفرت سی ہونے لگتی تھی۔

عاصمہ کی شیراز سے اکثر تکرار ماہا کے دیے ہوئے تحفوں پر ہوا کرتی تھی۔ ماہا ہر سال شیراز کی شادی کی سالگرہ کے دن پارسل روانہ کرتی تھی۔ ماہا کے گفٹ اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگتے تو وہ شیراز سے الجھ کر تکرار کرنے لگتی اور اماں ایسے موقعوں پر بات بڑھتے دیکھ کر دونوں کو سمجھا بجھا کر خاموش کرا دیتیں۔

شیراز بھی چاہتا کہ عاصمہ کو خوش رکھے۔ اس کی حق تلفی نہ کرے۔ ایک مرتبہ اس کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔ وہ عاصمہ سے وعدے کے مطابق جلدی گھر آگیا تھا۔ اماں اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ اس کے ہاتھ میں پیکٹ تھا۔ وہ اماں کو سلام کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ عاصمہ نے اس کے ہاتھ میں پیکٹ دیکھا تو وہ مسکرائی۔

"شکر ہے شیراز' آپ کو کیک لانا یاد رہا۔"

"نہیں عاصمہ' یہ تو ماہا نے مجھے گفٹ دیا ہے۔" اس نے جلدی سے پیکٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

عاصمہ کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ وہ پیکٹ کھول رہا تھا اور وہ اسے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ پیکٹ میں سے ایک خوب صورت گرے کلر کی شرٹ اور قیمتی پرفیوم نکلا۔

"کیسی ہے شرٹ عاصمہ؟" شیراز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

"تم شاید ناراض ہو کہ میں کیک لے کر نہیں آیا۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ باہر ڈنر کریں گے اور وہیں سے کیک بھی لے لیں گے مگر تم تیار نہیں ہوئیں۔"

"تیار تو ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماہا کا گفٹ دیکھ کر اس کا موڈ آف ہوگیا ہے۔

نہ جانے کیا سوچ کر وہ اسے بتانے لگا "عاصمہ' ماہا ان دنوں اسپتال میں ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ اس سے ملنے میرے ساتھ چلی چلنا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے' تم سے ملنے کو اس کا بہت دل چاہتا ہے۔"

عاصمہ نے اس کی بیماری پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا' وہ پرس اٹھا کر اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

اس دن بائیک پر بیٹھتے ہوئے دونوں کو احساس تھا کہ ان میں مزید کوئی بات چیت نہیں ہوسکتی۔ شیراز' عاصمہ کی سرد مہری پر اداس تھا۔ وہ انسانیت کے ناتے ہی ماہا کو اسپتال میں دیکھ آنے کی ہامی بھر سکتی تھی۔ دوسری طرف عاصمہ اپنے شوہر کی خود غرضی پر کھول رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم آج کے دن تو شیراز کو ماہا کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ انہی سوچوں میں مستغرق تھی کہ اس نے بائیک کے سامنے آتے تیز رفتار ٹرک کو دیکھا۔ شیراز نے ٹرک سے خود کو بچانے کے لیے رفتار ہلکی کردی مگر اس کی بائیک کو ٹرک کی زوردار ٹکر لگ ہی گئی۔ بائیک لہرا کر الٹی ہوگئی۔ وہ خود اچھل کر فٹ پاتھ پر جا گرا جبکہ عاصمہ شدید زخمی حالت میں بائیک کے نیچے آگئی تھی۔ شیراز نے سنبھل کر اس پر سے بائیک ہٹائی۔ اتنے میں سڑک پر کھڑے افراد نے ایمبولینس کا

بندوبست کردیا تھا۔

وہ رات سب پر بہت بھاری ثابت ہوئی۔

عاصمہ کی جان تو بچ گئی۔ شیراز کو بھی معمولی چوٹیں آئیں لیکن عاصمہ کے دماغ پر گہری چوٹ آنے کے باعث اس کی بینائی چلی گئی۔ اس کے کئی آپریشن ہوئے مگر ڈاکٹرز کے مطابق اب وہ اپنی آنکھوں سے کبھی دنیا کو نہیں دیکھ سکتی تھی جب تک اس کی آنکھوں میں نئے قرینے نہیں ڈالے جاتے۔

○☆○

صبح کے واقعے سے شیراز سارا دن آفس میں پریشان رہا تھا۔ پانچ سال اس کی شادی کو ہوگئے تھے اور روز اول کی طرح عاصمہ اب تک اس کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اسے صبح والے اپنے رویے پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ خواہ مخواہ عاصمہ پر ہاتھ اٹھا دیا تھا "نہ جانے اماں کیا سوچ رہی ہوں گی۔" وہ پچھتا رہا تھا۔ واپسی پر اس نے عاصمہ کے لیے سونے کی چین خریدی۔

وہ بڑا مسرور سا گھر کے اندر داخل ہوا۔ اماں ہمیشہ کی طرح برآمدے ہی میں مل گئیں۔

"السلام علیکم اماں۔" شیراز نے خوشگوار موڈ میں انہیں سلام کیا تو وہ ایک دم کھل اٹھیں۔

"جیتے رہو بیٹا۔" ان کے دل کو اطمینان ہوا کہ شیراز کا موڈ ٹھیک تھا۔

شیراز اپنے کمرے میں آگیا۔ عاصمہ نے پلٹ کر دیکھا اور اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ ہلکے گلابی کلر کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ کافی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر صبح کے ناخوشگوار واقعے کی کوئی جھلک تک نہ تھی۔

"ارے' آج تم نے کیک نہیں منگایا؟" شیراز نے پوچھا تو عاصمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں' آج میں نے کیک نہیں منگایا مگر آج میں تمہیں ایک گفٹ دینا چاہتی ہوں۔ بالکل انوکھا۔"

"اچھا تو پہلے تم اپنا گفٹ دکھاؤ' ویسے اس بار میں بھی تمہارے لیے گفٹ لایا ہوں۔" شیراز نے جیب میں سے سونے کی چین کی سرخ مخملی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا "مگر پہلے میں تمہارا گفٹ دیکھنا چاہوں گا۔ کیا انوکھا گفٹ ہے؟"

عاصمہ نے بھی ایک چھوٹی سی سرخ مخملی ڈبیا اس کی طرف بڑھائی "میرا خیال ہے عاصمہ' تم ہی کھول کر بھی دکھاؤ' آخر اس میں کیا ہے۔ میرا تجسس بڑھ رہا ہے۔" شیراز نے خوش دلی سے اصرار کیا۔

"خیر میں ہی کھول دیتی ہوں' کیا فرق پڑتا ہے۔" عاصمہ نے مخملی ڈبیا کھولی اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھائی۔ ڈبیا میں سوائے کالی راکھ کے کچھ نہ تھا۔ اس کے کھلتے ہی راکھ کمرے میں پھیل گئی تھی۔

"یہ یہ! کیا مذاق ہے عاصمہ۔" شیراز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

وہ بولی "شیراز حسن' یہ مذاق نہیں' حقیقت ہے۔ یہ ماہا کے تمام گفٹوں کی راکھ ہے۔ اسے جیسے چاہو سنبھال کر رکھ سکتے ہو۔ نہیں تو کھڑکی سے باہر ہوا میں اڑا دو۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی "شیراز حسن' عورت سب کچھ برداشت کرلیتی ہے مگر اپنے پیار کا بٹوارہ برداشت نہیں کرتی۔" اس نے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لفظوں کو چباتے ہوئے کہا۔

شیراز وہیں سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کیا سوچ کر آیا تھا اور کیا ہو گیا تھا پھر نہ جانے اسے کیا ہوا' ایک دم اسے ماہا کا بھولا سا چہرہ یاد آگیا۔ اسے ماہا کی باتیں' اس کی قربانیاں یاد آگئیں۔ ایک جھٹکے سے وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا "عامہ' تم بہت چھوٹے دل کی مالک ہو۔ تم نے ذرا سی بات کا افسانہ بنا لیا ہے۔" عامہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ مزید بولا "تمہیں اگر مجھ سے ذرا بھی محبت ہوتی تو ایسا نہیں کرتیں' تم مجھ سے محبت کا جو دعویٰ کرتی رہی ہو' سب جھوٹ ہے' فریب ہے۔ تم کیا جانو' محبت کیا ہوتی ہے۔ محبت صرف پا لینے کا نام ہی نہیں ہے' محبت ایثار کر دینے کا نام بھی ہے۔ حوصلہ ہے سننے کا تو سنو۔" شیراز ایک دم سے پھٹ پڑا تھا "ماہا دل کے مرض میں مبتلا تھی اور یہ مرض بھی اسے اس دن لگا جب میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ میں ماہا کو پسند کرتا ہوں مگر پھر بھی سب نے مل کر میری محبت کا خون کیا لیکن اس نے اس موڑ پر بھی میرا ساتھ دیا۔ جانتی ہو' کیوں۔ کیونکہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ جانتی تھی' محبت میں صرف پانا ہی نہیں ہوتا۔ اس نے بہت حوصلے سے میرا ساتھ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر شیراز' یہ تمہارا فیصلہ ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ شادی کے بعد بھی مجھ سے خوش دلی سے ملتی رہی۔ تمہارے متعلق اس نے کبھی کوئی غلط بات نہ کی۔ بلکہ وہ مجھے سمجھاتی تھی کہ میں تمہارا خیال رکھا کروں۔ تمہیں خوش رکھا کروں۔ اس نے تمہاری طرح کبھی کوئی جیلسی فیل نہیں کی۔ وہ دل کی مریضہ تھی' اسے ایک اٹیک ہوا تو اس کا بائی پاس کرایا گیا مگر قسمت کی خرابی دیکھو کہ بائی پاس کے باوجود اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس کو اسپتال میں کتنے ہی دن آئی سی یو میں رہنا پڑا۔ مصنوعی طریقے سے وہ زندہ رہی مگر آپریشن کے دوران وہ زندگی ہار گئی۔" شیراز کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ عامہ بھی حیرانی سے اسے تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پشیمانی جھلک رہی تھی "مگر جاتے جاتے بھی وہ ہمیں ایک انمول گفٹ دے گئی۔ تم نے اس کے دیے تمام گفٹ جلا کر مجھے پیش کر دیے مگر عامہ' تمہارے پاس اس کا ایک گفٹ موجود ہے۔ جسے تم نہ تو جلا سکتی ہو' نہ کھڑکی سے باہر پھینک سکتی ہو۔ وہ ہیں' یہ آنکھیں جن سے تم ایک بار پھر دنیا کو دیکھ رہی ہو۔ ماہا نے آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کی آنکھیں تمہیں دے دی جائیں۔ اسے معلوم تھا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد تم آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئی ہو۔ وہ اپنی محبت کو امر کر گئی۔ تمہیں اپنی آنکھیں سونپ کر اس نے گویا تمہیں روشنی بخش دی اور تم...." شیراز نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔

عامہ تو بہت بلندی سے ایک دم نیچے کی طرف گری تھی۔ راکھ کی ڈبیا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھی۔ ندامت کے آنسو اس کے رخساروں پر پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ وہ شیراز کو حاصل کر کے بھی محبت کی بازی ہار گئی تھی اور ماہا زندگی ہار کر بھی اپنی محبت کو امر کر گئی تھی۔

○☆○

تم حاصلِ زیست نہ تھے

فنکشن کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ نشا شیخ فنکشن کی تیاری میں آگے آگے تھی۔

"شارم! تم نے کچھ سنا۔ نشا اس سالانہ فنکشن میں موسیقی میں حصہ لے رہی ہے۔"

"کون نشا؟" شارم نے چائے کا خالی مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"حد ہو گئی یار' تم کہاں رہتے ہو۔ نشا کو نہیں جانتے۔ ایک سال سے وہ ہماری کلاس میٹ ہے اور جو ہمارے گروپ کی سب سے زیادہ دل پسند ممبر بن گئی ہے۔ وہ پوری یونیورسٹی کے لڑکوں کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے۔ پچھلے سال والے فنکشن میں تو تم آئے نہیں تھے۔ بہترین مقررہ کا ایوارڈ پرنسپل سرذاکر سے وصول کیا تھا۔ اتنی زبردست تقریر کی تھی کہ سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ بہت شوخ چنچل ہے۔ ہنستی بہت ہے' پرنسپل ذاکر ایک بار اسے ٹوک بھی چکے ہیں مگر میں نے محسوس کیا ہے' اس کی دل نشین مسکراہٹ کے سرذاکر بھی اسیر ہوئے ہیں۔ اس کی بھوری آنکھیں اور مسکراہٹ تو پوری یونیورسٹی میں مشہور ہے۔"

"اچھا' وہ.... ان کا نام نشا ہے؟" شارم نے کینٹین سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں چلے؟" وقار نے باہر آتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"پرنسپل ذاکر کے پاس جا رہا ہوں۔" شارم نے کہا تو وقار بولا۔

"کیا یہ پوچھنے کہ آپ نشا کی بھوری آنکھوں اور مسکراہٹ کے اسیر کیوں ہیں؟" وقار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار' فضول باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔ مجھے سرذاکر سے کام ہے۔"

○☆○

فنکشن شروع ہو چکا تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر نظر ڈالتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ سامنے کی کئی نشستوں پر سرذاکر وغیرہ اور ان کے کولیگ بیٹھے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔ وہ آج پہلی بار ایسے فنکشن میں نظر آیا تھا۔ اس سے پہلے جتنے بھی سالانہ فنکشن ہوتے رہے تھے' وہ ہمیشہ اس دن غائب

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہوجاتا تھا۔

وہ وقار اور عمیر کے درمیان والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

"یقین نہیں آرہا تمہارے آنے کا' پہلی بار فنکشن میں شرکت کررہے ہو۔ آج نشا کو گاتے ہوئے سن سکو گے۔"

"یہی کیا کم ہے کہ آگیا ہوں۔ بابا جان کے آفس کا کام نمٹا کر آرہا ہوں۔ تمہیں تو پتا ہے جب سے شجاع بھائی مسقط گئے ہیں' بہت سی ذمے داریاں مجھ پر آن پڑی ہیں" شارم نے بتایا۔

"چلو' یہی کیا کم ہے' دیر سے سہی آتو گئے۔ ابھی تو آدھا فنکشن باقی ہے" وقار نے ڈائس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ڈائس پر مسز بخاری اناؤنسمنٹ کررہی تھیں۔

"اب آپ کے سامنے اپنی خوب صورت آواز میں مس نشا شیخ ایک گیت سنانے آرہی ہیں۔"

اناؤنسمنٹ ہوتے ہی نشا شیخ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی ہوئی ڈائس پر نمودار ہوئی۔ پنک کلر کے کامدانی سوٹ میں اس کا حسن اور بھی نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ کانوں میں میچنگ کے آویزے جھلملا رہے تھے۔ گولڈن ریشم جیسے سلکی بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور بھوری آنکھوں نے اس کے حسن کو نمایاں کیا ہوا تھا۔

شارم نے آج پہلی بار اتنے غور سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی خوب صورت آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

صدا ہوں اپنے پیار کی
جہاں سے بے نیاز ہوں
کسی پہ جو نہ کھل سکے
وہ زندگی کا راز ہوں
صدا ہوں اپنے پیار کی
سنے اگر میری صدا
تو چلتے کارواں رکیں
بھلا کے اپنی گردشوں کو
سات آسماں رکیں
میں حسن کا غرور ہوں
میں دلبری کا راز ہوں

گانا ختم ہوچکا تھا۔ وہ ڈائس سے اتر کر جاچکی تھی مگر شارم اس کے سحر میں گرفتار گم صم سا بیٹھا ڈائس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک انجانی سی خواہش نے جنم لیا تھا۔ لمحوں میں اس کا دل نشا کا اسیر ہوگیا تھا۔ ڈائس پر دوسرا آئٹم ایک خاکہ تھا جو شروع ہوچکا تھا مگر شارم تو ابھی تک اس آواز کے سحر میں کھویا

ہوا تھا۔ وہ اس کے تصور میں تھی۔

"لوٹ آؤ یار! وہ جاچکی ہے" وقار نے جو کافی دیر سے اس کی کیفیت کو نوٹ کررہا تھا' اس کے آگے ہاتھ لہرایا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔

"چلو یار! باہر چلتے ہیں" اس نے آہستہ سے وقار سے کہا۔

"ابھی تو کافی آئٹم باقی ہیں۔ اب ایسا بھی کیا اور ایسی بھی بے صبری اچھی نہیں۔ یا تو اتنے بے خبر کہ نام تک سے واقفیت نہیں تھی" وقار سرگوشی کے انداز میں مسکرایا۔ شارم نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وقار کے ساتھ عمیر کی بھی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

یہ یونیورسٹی کا ہی خوب صورت لان تھا جہاں ڈنر کا انتظام کیا گیا تھا۔ لڑکیاں اور لڑکے اپنا اپنا گروپ بنائے کہیں کھڑے اور کہیں اپنی پلیٹ ہاتھوں میں لیے یا کچھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم تھا۔ رنگین روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ شارم کی بے چین نظریں اسی کو تلاش کررہی تھیں اور تب ہی اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سامنے کی ٹیبل کے ساتھ کھڑی نظر آگئی۔ دل کو جیسے قرار آگیا۔ وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی نے اس کے کانوں میں جلترنگ سے بجادیے۔ وہ اپنی پلیٹ لیے اس کی طرف آگیا۔

"ایکسکیوزمی! آپ تو بہت اچھا گالیتی ہیں" وہ شائستگی سے مخاطب ہوا تو اس کے ساتھ کھڑی اس کی ساتھی لڑکیوں نے حیرت سے شارم کی طرف دیکھا جو کسی لڑکی سے بات کرنا پسند نہیں کرتا' وہ نشا شیخ سے اتنے بے تکلف انداز میں مخاطب تھا۔

"جی شکریہ!" نشا نے خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وقار اور عمیر بھی اُدھر ہی آگئے تھے۔

نشا نے اچانک رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ اچھے خاصے لوگ رخصت ہوچکے تھے۔

"اچھا دوستو' میں تو چلتی ہوں۔"

"ابھی رکو' میں بھی چل رہی ہوں۔"

"آؤ فٹافٹ!" وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ نشا نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو اس کی نظر شارم کی نظروں سے ٹکرا گئی۔ وہ اپنی گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"شارم جی تو گئے کام سے" انیلہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں نشا سے کہا تو نشا ہولے سے مسکرادی۔

"لگتا ہے دونوں طرف ہی معاملہ گڑبڑ ہوگیا ہے۔ بھئی کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔"

نشا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے گاڑی سڑک پر دوڑادی۔

"ویسے نشا اتفاق ہی سے ... شارم اس فنکشن میں پہلی بار شریک ہوئے ہیں۔ فنکشن تو ہر سال ہی ہوتے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہیں مگر شارم تو کبھی فنکشن میں نظر آئے ہی نہیں۔ شاید تمہارے گیت کی کی اتنی دھوم پہلے ہی سے تھی کہ شارم بھی شاید اسی وجہ سے کھنچے چلے آئے تھے۔ میں نے شارم کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑی چمک دیکھی ہے۔ آج بار بار ان کی نظریں تمہارے سراپا میں الجھ رہی تھیں۔"

"اچھا تو آج کا دن تم نے اسی کام میں گزارا؟" نشا نے ہنستے ہوئے کہا تو انیلہ بولی۔

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ شارم کی مسحور کن شخصیت کے سحر میں تم بھی الجھ گئی ہو۔"

"یہ محبت ہے ہی ایسی چیز' جب ہوتی ہے نا تو خود اپنے آپ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ بڑے چپکے سے وار کرتی ہے۔ بندہ سنبھلنے ہی نہیں پاتا ہے جب تک وہ سنبھلے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنا کام دکھا چکی ہوتی ہے" انیلہ نے بڑی سنجیدگی سے محبت کی تشریح کی تو وہ ایک دم مسکرا دی' بولی کچھ نہیں۔

"تمہاری خاموشی یہ بتا رہی ہے کہ تمہارا دل بھی اس کا اسیر ہو گیا ہے۔"

"بکو مت' اترو گھر آ گیا ہے۔ محبت کوئی کھیل نہیں ہے جو یوں پل میں کھیلا جائے" نشا نے مسکراتے ہوئے کہا تو انیلہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تھوڑا وقت گزرنے دو پھر پوچھیں گے۔"

"اوکے" انیلہ اُتر گئی تو نشا نے واپسی کے لیے گاڑی موڑ لی۔

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا تھا کہ وقت گزرنے کے احساس ان دونوں کو جب ہوا' جب لاسٹ ایگزام کے بعد چھٹیاں سر پر آ گئیں۔ این ای ڈی یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ مکمل ہو گیا تھا دونوں کا' آج این ای ڈی یونیورسٹی میں ان کا لاسٹ ڈے تھا۔ دونوں اداس تھے خاص کر شارم بہت اداس تھا۔ اس نے کبھی گھر میں نشا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی یہ بات اس کے قریبی دوستوں کو معلوم تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ نہ تو وہ کبھی نشا کو لے کر باہر گیا تھا اور نہ ہی وہ یونیورسٹی میں اس کے اتنا قریب نظر آتا تھا کہ لوگ محسوس کر سکیں۔ اس نے اپنے اور نشا کے درمیان میں ایک مناسب فاصلہ رکھا ہوا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی محبت کے چرچے عام ہو جائیں۔ وہ یونیورسٹی میں ایسے طالب علموں سے چڑتا تھا جو فری پیریڈ میں کبھی کسی درخت کے نیچے اور کبھی کسی اور کونے میں بیٹھے لوگوں کی تیز نظروں سے بے خبر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گپیں لگا رہے ہوتے۔ محبت کا امین درختوں کو بنا رہے ہوتے۔ پیپل کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر محبوبہ کا نام لکھتے اور پھر وہ نام ہر نظر سے گزرتا وہ اپنی محبت کو رسوا کر کے فخر محسوس کرتے۔ وہ سمجھتا تھا یہ حرکت محبت جیسے جذبے کی توہین ہے کہ آپ اسے عام کر دیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ نشا کا ذکر اپنے گھر میں بھی نہ کر سکا تھا۔ کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔

مگر کل رات ہی اس کے بابا جان نے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ کر شارم کو بے کل کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر سے کلاس روم میں اکیلا بیٹھا سوچے جا رہا تھا کہ وہ بابا جان کو کیا جواب دے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ نشا آ گئی۔

"گھر نہیں جانا ہے؟" اس کی آواز پر وہ یک دم چونک گیا۔ "شارم اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ یہ ساتھ وقتی تھا' تعلیم مکمل ہو گئی تھی' عارضی طور پر ہم جدا ہو رہے ہیں۔ اب باقی سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہجر کا

موسم بھی بیت جائے گا۔ محبت کی آزمائش کا وقت تو اب آیا ہے۔ پہلا قدم تمہیں اٹھانا ہے" وہ اس کے اشارے کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔ کتنا یقین ہے' کتنا اعتماد ہے مجھ پر۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں نشا کہ بابا جان کیا چاہ رہے ہیں؟

"ظاہر ہے پہلا قدم تو مجھے اٹھانا ہو گا۔ میں اماں سے آج ہی تمہارا ذکر کروں گا" شارم نے زبردستی مسکراتے ہوئے ہولے سے کہا۔ آنے والے حسین خوابوں کو آنکھوں میں سجائے وہ رخصت ہو گئی۔

وہ کافی رات کو گھر پہنچا تو بابا جان سونے کے لیے جا چکے تھے۔ وہ بھی اطمینان کا سانس لیتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

صبح وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کے بابا جان کرامت حسین نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ فوراً ہی ان کے کمرے میں آ گیا۔ سامنے تخت پر رئیسہ بیگم بیٹھی تھیں۔ کرامت حسین فرم جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"السلام علیکم بابا جان!" شارم نے بڑے ادب سے باپ کو سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹا شارم! اب تو تم تعلیم سے فارغ ہو چکے ہو۔"

"جی بابا جان!" شارم نے مختصر جواب دیا۔

"بیٹھ جاؤ' کھڑے کیوں ہو۔ یہ تم ہر وقت گھوڑے پر سوار کیوں رہتے ہو؟" انہوں نے ترش لہجے میں کہا تو شارم خاموشی سے رئیسہ بیگم کے قریب تخت پر بیٹھ گیا۔

"دیکھو بیٹا شارم! اب تم مستقل طور پر میرا آفس سنبھال لو۔ بزنس کو اچھی طرح سمجھ لو کیونکہ یہ بزنس تمہیں ہی ڈیل کرنا ہے۔ شجاع تو مسقط میں سیٹ ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں اس عید پر تمہاری اور شجاع کی شادیاں ساتھ ہوں۔" انہوں نے آہستہ لہجے میں اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"مگر بابا جان' ابھی میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ ابھی مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ اپنا کوئی مقام بنا لوں پھر شادی بھی کروں گا۔ بابا جان ابھی تو شجاع بھائی کی باری ہے۔"

"پھر تم نے وہی بات شروع کر دی۔ میں نے تمہیں اس دن بھی بتا دیا تھا کہ میں شیخ افضل کو زبان دے چکا ہوں۔"

"مگر بابا جان میں نے ابھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔"

"تمہیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔"

"مگر بابا جان!" شارم نے کچھ کہنا چاہا' انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔"

شارم نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا "امی آپ تو کچھ بولیں۔"

"تم اپنے کمرے میں جاؤ" ماں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اتنی دیر سے دونوں باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں۔

شارم اٹھ کر تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رئیسہ بیگم دھیمے دھیمے لہجے میں کرامت حسین سے مخاطب ہوئیں۔

"جوان اولاد ہے' زمانہ بدل گیا ہے۔ اب کوئی فیصلہ بلکہ کوئی ارادہ کرنے سے پہلے اولاد کی مرضی معلوم کرلی جاتی ہے اور بھلا اس میں ہرج بھی کیا ہے۔ یہ تو شرعی حق ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کرامت حسین نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"لڑکا ہے' کوئی لڑکی نہیں ہے کہ ہم زبردستی اپنے فیصلے....."

"بس کرو' تم بھی احمق ہو اپنے بیٹے شارم کی طرح" انہوں نے کہا "میرا اتنا بھی حق نہیں کہ میں اپنی مرضی سے اپنی اولاد کے فیصلے کروں۔ شیخ افضل میرا بزنس پارٹنر ہے۔ خاندانی ہے' ہمارے ہم پلہ ہے۔ چاندنی' شیخ افضل کی سب سی چھوٹی بیٹی ہے۔ بیٹا تو کوئی افضل کا ہے نہیں۔ صرف تین بیٹیاں ہیں۔ دو کی شادی ہوگئی ہے اور دونوں امریکا میں ہیں۔ چاندنی اکثر اپنے باپ کے آفس آتی رہتی ہے' وہیں میں نے اسے دیکھا تو بات ہی بات میں افضل سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ شیخ افضل نے میری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا تھا "کرامت اگر ایسا خیال تمہارا ہے تو مجھے یہ نیا رشتہ جوڑ کر بہت خوشی ہوگی۔ ۲۵ سال سے ہماری دوستی ہے۔ اور ہم بزنس پارٹنر بھی ہیں۔"

"مگر شارم کی مرضی نہیں ہے تو کیا کیا جائے؟"

"یعنی تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں چاندنی کا رشتہ مانگ کر اب پیچھے ہٹ جاؤں۔ میری اس حرکت سے میرے اور افضل کے تعلقات کشیدہ نہیں ہوجائیں گے؟ وہ کیا سوچے گا' کرامت کو اپنی اولاد پر اتنا بھی اختیار نہیں ہے۔"

"میرا تو خیال تھا ہمیں پہلے اپنے خاندان کی لڑکیوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ بھائی صاحب کی ایرج میں کیا کمی ہے۔ اگر میں کہوں تو بھائی صاحب بھی انکار نہیں کریں گے" رئیسہ بیگم نے اپنا خیال ظاہر کیا "یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ اپنے خاندان کی اچھی خاصی لڑکیوں کو نظرانداز کرکے باہر جھانکتے پھریں۔"

"بس رہنے دو' مجھے رشتے غیروں میں کرنا پسند ہیں۔ خاندان بڑھتا ہے۔ تم پہلے ہی شجاع کے لیے سعیدہ کی قرینہ کو منتخب کرچکی ہو۔ اب شارم کے لیے ایرج کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ یہ بتاؤ' ہمارے گھر میں بھی تو دو لڑکیاں تھیں۔ کیا تمہارے بھائی صاحب یا سعیدہ نے سوچا۔ سعیدہ کے تو ماشاء اللہ سے پانچ بیٹے ہیں اور سب کے سب اعلیٰ عہدے پر' اعلیٰ تعلیم یافتہ' کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ مومل کے لیے وہ بڑے فخر سے کمشنر کی بیٹی بیاہ کرلائیں۔ اپنے سے چار گنا بڑا ہاتھ مارا۔ یہی صورتِ حال دیکھ کر میں نے رقیہ کی شادی غیروں میں کی اور اللہ نے چاہا تو فائزہ کے لیے بھی بہت اچھا رشتہ غیروں میں مل جائے گا۔"

"لو تم طعنے دینے بیٹھ گئے۔"

"ضروری تو نہیں اگر ان لوگوں نے نہیں سوچا تو ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔"

"دیکھو رئیسہ' میں فضول بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ وہ اولاد ہی کیا جو باپ کی زبان کا پاس نہ کرے۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کل شام تیار رہنا اور ہاں لڑکیوں کو بھی ساتھ لے لینا۔ رقیہ بھی آئی ہوئی ہے' وہ بھی دیکھ آئے گی۔ تم لوگ ایک چکر لگا آؤ تو پھر رسم کردیں گے۔"

کرامت حسین بڑے مسرور انداز میں اپنا فیصلہ سنا چکے تو رئیسہ بیگم بولیں۔

"آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہ رہے ہیں۔ شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے سعیدہ سے بھی بات کرنی ہے۔"

"اچھا' میں تو چلتا ہوں۔ تم اپنے طریقے سے شارم کو سمجھادو کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔" کرامت حسین اتنا کہہ کر چلے گئے اور رئیسہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں کہ کیا کریں؟

وہ جانتی تھیں کہ کرامت حسین جو فیصلہ کرلیتے ہیں' اس پر قائم رہتے ہیں۔

اسی وقت شارم دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"امی کچھ بات بنی؟" انہوں نے پوچھا۔

"شارم' فضول بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہیں تو پتا ہے' تمہارے باپ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں کیوں انکار ہے۔ اعلیٰ خاندان ہے' باحیثیت ہے۔ لڑکی خوبصورت بھی ہے۔ کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر تم ایک نظر چاندنی کو دیکھنا چاہتے ہو تو یہ تو میں کرسکتی ہوں۔ نہ شیخ افضل کو اعتراض ہوگا اور نہ تمہارے بابا جان کو۔"

"امی! بات یہ ہے کہ مجھے اپنی پسند سے شادی کرنی ہے مگر آپ سب کی رضامندی سے۔"

"بیٹا' میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ تم باپ بیٹے اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو اور تم نے تو باپ کے منہ پر صاف انکار کردیا۔ یہ کوئی مناسب بات تو نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے فیصلے ہمیشہ بزرگ ہی کیا کرتے تھے کیا مجال ہے کہ اولاد انکار کردے بلکہ بڑی خوشی سے ان کے فیصلوں کا احترام کیا جاتا تھا۔"

"پلیز امی! کس زمانے کی بات کررہی ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو خود والدین پہلے اولاد کی منشا مرضی معلوم کرلیتے ہیں پھر کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔" شارم نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا شارم! زمانہ کبھی نہیں بدلتا اور نہ بدلے گا بلکہ سوچیں بدل گئی ہیں۔"

"امی! آپ تو بابا جان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں اپنا مقدمہ کس کے پاس لے کر جاؤں۔ میری وکالت کون کرے گا؟"

"اپنا مقدمہ اللہ پر چھوڑ دو۔ وہی درست فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں' زمین پر نہیں۔ اگر چاندنی تمہاری تقدیر میں لکھ دی گئی ہے تو وہی تمہاری دلہن' تمہاری شریکِ سفر بنے گی۔ بیٹا' اصل فیصلہ تو اوپر والا پہلے ہی کرچکا ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں کے آگے نہ تمہارے بابا جان کے فیصلوں کی کوئی حیثیت ہے اور نہ تمہارے ارادے کی۔"

شارم کوئی جواب دیے بغیر تھکے تھکے سے انداز میں کمرے سے باہر چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد رئیسہ بیگم نے رقیہ کو اپنے کمرے میں بلا کر بتایا کہ کل شیخ افضل کے یہاں جانا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتادیا کہ شارم راضی نہیں ہے' وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر پھر بھی تمہارے بابا جان اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہ سب سن کر رقیہ سوچ میں پڑ گئیں۔

رقیہ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھیں۔ ان سے بڑے شجاع اور رقیہ کے بعد شارم اور فائزہ۔ رقیہ کی شادی کو دو سال ہوئے تھے۔ ان کے میاں قمر شپ پر انجینئر تھے۔ اس لیے وہ زیادہ تر ملک سے باہر ہی ہوتے تھے۔ رقیہ کے سسرال میں کوئی تھا نہیں' یہی وجہ تھی کہ رقیہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔

رقیہ بیٹھی کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں "امی' ایسا کرتے ہیں کہ پہلے تو بابا جان کی مرضی کے مطابق لڑکی دیکھ آتے ہیں۔ بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے میں شارم کو راضی کرلوں۔"

"اللہ کرے' ایسا ہی ہو' شارم مان جائے۔"

○☆○

یونیورسٹی بند ہوئے ایک ماہ ہو رہا تھا۔ اس ایک ماہ میں صرف ایک بار نشا کا فون آیا تھا اس کے بعد نہ اس کا فون آیا تھا اور نہ ہی وہ فون پر ملی تھی۔ وہ کئی بار فون کر چکا تھا مگر ہر بار فون انگیج ملا تھا۔ یا ملتا تو کوئی خاتون رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیتیں۔ ان دنوں اس پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بابا جان کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا' وہ اپنی بات منوانے کے عادی تھے۔ جب سے ماں بہنیں شیخ افضل کے گھر ہو کر آئی تھیں' چاندنی کی خوبصورتی کا ذکر گھر میں چھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک ہی ذکر سے تنگ آگیا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگتی۔ کرامت حسین کی مرضی کے مطابق وہ روزانہ ان کے آفس جانے لگا تھا۔ گھر آتا تو اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔

رقیہ کئی روز سے اس کی یہ حالت دیکھ رہی تھیں۔ اس نے کسی بات پر مسکرانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی' وہ ابھی ابھی آفس سے آکر ماں کو سلام کرتا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماں کے ساتھ فائزہ اور رقیہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کو اس نے نظر انداز کیا تھا۔ رقیہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ ناراض ناراض سا ہے۔ رقیہ کچھ سوچتی ہوئی اٹھیں اور دوسرے لمحے وہ اس کے کمرے میں تھیں۔

"شارم! کیا بات ہے تم آج کل بہت اپ سیٹ سے نظر آرہے ہو؟"

"اچھا تو آپ کو خیال آ ہی گیا۔ آپ کو تو پتا ہے آپ سب نے مل کر مجھے پریشان کیا ہوا ہے" شارم نے بڑی سادگی سے شکوہ کیا تو رقیہ ہولے سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو شارم' جذباتی انداز میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔ ایک بات یاد رکھو' بزرگوں کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ چاندنی واقعی بہت اچھی' خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی شیخ افضل کے بزنس کو ڈیل کرے گی۔ شیخ افضل کہہ رہے تھے چاندنی' میری بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے سول انجینئرنگ کی تعلیم کی اجازت دی تھی۔ وہ چاہے گی تو اس لائن کو بھی اپنا سکتی ہے اور شارم یہ تو بڑی اچھی بات ہے بابا جان بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کے بزنس کو تم سنبھالو۔ اور اگر چاندنی سے تمہاری شادی ہو گئی تو تم دونوں مل کر اچھی طرح اس بزنس کو ڈیل کر سکو گے۔"

"رقیہ آپا! مجھے بابا جان کے ایکسپورٹ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سول انجینئرنگ کیا ہے اور اسی میں اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہوں۔ شادی میں اپنی کلاس فیلو نشا سے کروں گا۔ اگر بابا جان اپنا فیصلہ نہیں

بدل سکتے تو میں بھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کروں گا۔"

"کیا تمہارا یہی آخری فیصلہ ہے؟" رقیہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' مگر شادی میں ابھی نشا سے بھی نہیں کروں گا۔ بس میں چاہتا ہوں بات طے ہو جائے۔ اگر بابا جان کو اپنی زبان کا اتنا بھرم رکھنا ہے تو شجاع بھائی آرہے ہیں' شیخ افضل کی بیٹی ان کے لیے منتخب کرلیں" شجاع کے نام پر رقیہ چونک گئی۔

"ایسا ہو تو سکتا ہے اور اس میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ شجاع بھائی کے لیے تو امی سعیدہ خالہ کی قرینہ کو منتخب کیے بیٹھی ہیں۔ شجاع بھائی کا تو پتا نہیں مگر قرینہ بھی شجاع بھائی کو پسند کرتی ہے۔"

"رقیہ آپا! آپ کو سب سے ہمدردی ہے۔ قرینہ شجاع بھائی کو پسند کرتی ہیں۔ مگر میری محبت جو چند مہینوں کی نہیں' چار سالوں کی محبت ہے' جس کا آپ لوگوں کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے۔"

رقیہ ان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ "مگر شارم' یہ تو سوچو' اس طرح بہت سے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔ امی کی برسوں پرانی خواہش ادھوری رہ جائے گی۔ قرینہ کا دل ٹوٹ جائے گا اور سعیدہ خالہ سے تعلقات الگ کشیدہ ہو جائیں گے۔ چلو پھر بھی میں بابا جان سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں" رقیہ نے کہا تو وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔

"رقیہ آپا! بابا جان آپ کی بات مانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

"اچھا زیادہ مکھن نہ لگاؤ۔ میں آج ہی بات کروں گی" رقیہ یہ کہتے ہوئے اس کے کمرے سے باہر آگئیں۔

رقیہ کافی دیر سے کرامت حسین کے کمرے میں گئی ہوئی تھیں۔ رئیسہ بیگم بھی ادھر ہی تھیں۔ شارم باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ نہ جانے رقیہ آپا کی بات پر بابا جان کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں پلٹ آئے تھے۔ ابھی انہوں نے ٹی وی آن کیا ہی تھا کہ رقیہ آپا آگئیں۔

"کیا خبر لائیں؟" شارم نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر چیئر پر بیٹھ گئیں۔

"پلیز رقیہ آپا! کچھ تو بتائیں" شارم نے پھر پوچھا تو وہ بولیں۔

"ابھی عشق میں امتحان اور بھی ہیں" رقیہ ترنگ میں گنگنائیں۔

"حد ہو گئی ہے رقیہ آپا! یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"

پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو شارم! میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ جب تک شجاع بھائی نہیں آجاتے' اس وقت تک صبر سے بیٹھو۔ جلد بازی اچھی نہیں۔ کچھ کچھ تو بابا جان راضی ہو گئے ہیں مگر فیصلہ تو شجاع بھائی کے آنے کے بعد ہی ہوگا۔ بہرحال شارم امید پر دنیا قائم ہے۔ تم بھی اچھی امید رکھو شاید کوئی راستہ نکل آئے" رقیہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تو شارم کچھ مطمئن ہو گئے جیسے انہیں یقین تھا کہ شجاع مان جائیں گے۔

○☆○

لونگ روم میں محفل جمی ہوئی تھی۔ ایرج آئی ہوئی تھی۔ فائزہ' شارم اور نشا کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔ شارم بھی ادھر ہی آگئے۔ ایرج نے شارم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"شارم بھائی! ہمیں بھی نشا کے درشن کرائیں۔ دیکھیں تو آخر ہیں کیسی جو آپ...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو گی تو ہوش اڑ جائیں گے" شارم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے افسوس' وہ اتنی ڈراؤنی بلا ہیں" ایرج نے برجستہ جواب دیتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں تو فائزہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔

"ایرج! شارم بھائی کا مطلب ہے کہ ان کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"فائزہ تم یہاں بیٹھی ہوئی گپیں لگاتی رہو گی' چلو کچن میں جا کر بوا کلثوم کا ہاتھ بٹاؤ۔ وہ ڈائننگ روم میں کھانا لگا رہی ہیں۔"

وہ سب کے سب ڈائننگ روم میں آ گئے۔ ماموں' ممانی پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

"پھوپا جان نظر نہیں رہے' پھوپو بیگم!" ایرج نے اپنی چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا تو رئیسہ بیگم بولیں۔

"وہ تمہارے پھوپا جان شیخ افضل کی طرف گئے ہیں۔"

شیخ افضل کے نام پر ایرج نے معنی خیز انداز میں شارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شارم بھائی! یہ نام سن کر تو آپ کا حلق تک کڑوا ہو گیا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے بی بی سی نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ شارم نے فائزہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو رقیہ بھی مسکرانے لگیں۔

"شارم کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" رئیسہ بیگم نے شارم کو ٹوکا تو وہ سب کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آج وہ سب بہت خوش تھے۔ صبح کی فلائٹ سے شجاع اچانک بغیر اطلاع دیے آ گئے تھے۔

"شجاع بھائی' آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ ہم لوگ آپ کو لینے ائرپورٹ آتے۔ کتنا مزہ آتا" فائزہ نے کہا۔

"ہاں' وہ جو تم نے نیا جوڑا بنوایا ہے اسے پہننے کا بہانہ بھی ہاتھ آ جاتا" شارم نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو شجاع بولے۔

"بھئی' میں تو اس کے لیے کئی جوڑے لایا ہوں۔ مجھے پتا ہے نا اسے نئے نئے جوڑے بنانے کا جنون ہے۔"

"ارے سنو رقیہ! بھائی صاحب کے اور سعیدہ کے یہاں فون تو کر دو کہ شجاع آ گئے ہیں ورنہ وہ لوگ گلہ کریں گے کہ بتایا بھی نہیں۔ شام کے کھانے پر سب کو بلا لو۔"

"اچھا' امی کر دیتی ہوں فون!" یہ کہتے ہوئے رقیہ دوسرے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

شام اتری تو گھر میں ایک رونق سی پھیل گئی تھی۔ ماموں' ممانی' ایرج' سعیدہ خالہ اور قرینہ اطلاع ملتے ہی آ گئی تھیں۔ شجاع ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آرام کر کے اٹھے تھے کہ یہ سب آ گئے۔

"السلام علیکم!" انہوں نے بڑے ادب سے ماموں' ممانی اور خالہ کو سلام کیا۔

"بھئی بغیر اطلاع کے آ کے تم نے خوب سرپرائز دیا۔"

"جی ماموں جان۔ ایسے سرپرائز سے اچانک جو خوشی ہے نا اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" انہوں نے کہتے ہوئے قرینہ کی طرف دیکھا۔

قرینہ کا چہرہ گلاب کے تازہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت شارم کی نظر ان دونوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اچانک کچھ سوچ کر رہ گئے۔ ایک دم اداسی سی چھا گئی تھی۔ شجاع اور قرینہ کے چہرے پر انہوں نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔

"ارے' شارم تم کیوں اتنے خاموش سے بیٹھے ہو؟" قرینہ نے شارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی کیا کروں۔ میرے پاس باتوں کا ذخیرہ ہمیشہ ہی کم پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ذخیرہ اندوز تو ایرج اور فائزہ ہیں جن کے پاس اسٹاک موجود رہتا ہے" شارم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

○☆○

"چاندنی! کیا کر رہی ہو؟" زاہدہ بیگم نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آیئے مما! بس یونہی ذرا میگزین پڑھ رہی تھی" اس نے فیشن میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

"چاندنی! تمہارے لیے ایک بہت اچھا پرپوزل آیا ہوا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ کچھ عرصے پہلے تمہارے پاپا کے دوست کی فیملی آئی تھی۔"

"اچھا' وہ فائزہ وغیرہ" چاندنی نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ہاں' وہی لوگ۔ یہ رشتہ کافی دنوں سے چل رہا تھا۔ تمہارے پاپا اور میں نے یہ پرپوزل منظور کر لیا ہے۔"

"وہاٹ؟" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی "امی' کیا میں اتنی غیر اہم ہو گئی ہوں کہ آپ نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"نہیں چاندنی' یہ بات نہیں ہے۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے' وہ تمہارے لیے بہتر ہی کیا ہے اور پھر میں بتا تو رہی ہوں۔"

"مگر امی...!"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہارے پاپا کے دوست کا بیٹا ہے۔ ایم بی اے ہے اور مسقط میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ ان دنوں پاکستان آیا ہوا ہے اور وہ لوگ جلد ہی کوئی رسم کرنے آنے والے ہیں۔ شادی عید پر رکھی ہے۔ دو بیٹے' دو بیٹیاں ہیں۔ ایک شادی شدہ اور دوسری کنواری ہے۔ شجاع سب سے بڑے ہیں۔ مختصر فیملی ہے۔ تمہارے پاپا کا دیکھا بھالا گھرانا ہے' کوئی جانچ پڑتال نہیں کرنی ہے۔ ہم پلہ ہیں۔ پہلے چھوٹے بیٹے کے لیے ارادہ تھا مگر پھر بڑے کے ساتھ سمجھوبات پکی ہے۔"

"اف مائی گاڈ!" وہ ایک دم دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"تو ان کے قول و فعل کا کچھ پتا ہی نہیں کہ پہلے چھوٹے بیٹے کے لیے کہہ رہے تھے اور اب رشتہ بڑے سے طے کردیا ہے۔ آگے ہو سکتا ہے وہ اس بات سے بھی بدل جائیں۔ آپ نے مجھ سے معلوم کرلیا ہوتا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ آپ کیسی ماں ہیں مما' مجھے تو آپ پر بڑا مان تھا کہ ایسا وقت آیا تو آپ مجھ سے ضرور معلوم کریں گی" چاندنی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے شکوہ کیا۔

"چاندنی! ہم دونوں نے تمہارے مستقبل کے لیے ایک بہترین رشتے کا انتخاب کیا ہے۔ تمہارے پاپا شجاع سے ملتے رہے ہیں۔ جب وہ باہر نہیں گئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں صورت اور سیرت کا بہت اچھا' سلجھا ہوا لڑکا ہے۔"

"مما! آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں؟ میں.... میں...." چاندنی نے کچھ کہنا چاہا۔

"فضول باتیں میں سننے کی عادی نہیں۔ تمہاری دونوں بہنوں کی شادیاں جہاں ہم نے کیں وہ دیکھو.... کتنی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔ ان دونوں نے تو مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پہلے ان سے معلوم کرتی پھر رشتہ کرتی" زاہدہ بیگم ترش لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" چاندنی پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک اس کی زندگی کا اہم فیصلہ ہو جائے گا۔

○☆○

شجاع' کرامت حسین کے کمرے میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کرامت حسین نے انہیں خاموش دیکھ کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"شجاع! پرسوں رات میں نے تم سے شیخ افضل کی بیٹی کا ذکر کیا تھا۔ پہلے میں نے شارم کے لیے انتخاب کیا تھا مگر اس نالائق نے تو صاف انکار کردیا۔ تو بیٹا میں نے شیخ افضل سے تمہارے لیے بات کرلی ہے۔ شیخ افضل کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم سے تو وہ خاص کر بہت متاثر ہے۔ شارم نے انکار کیا تو رقیہ کے کہنے پر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ زبان کا پاس تو رکھنا ہے۔ لڑکی اچھی ہے' مجھے پسند ہے۔ اگر وہ تمہاری دلہن بن کر اس گھر میں آئے گی تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ مجھے تم پر بڑا مان ہے۔ تم نے میری کوئی بات کبھی رد نہیں کی۔"

کرامت حسین نے کچھ اس طرح فخریہ انداز سے کہا کہ شجاع کے قدم ڈگمگا کر رہ گئے۔ ایک طرف باپ کی خواہش تو دوسری طرف قرینہ کی محبت' جسے وہ جی جان سے چاہتے تھے مگر شاید ان کی خاموش چاہت سے بھی بے خبر تھے۔ وہ تو شروع سے بہت سنجیدہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کو کسی نے قرینہ سے بھی زیادہ فری ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے آپ کو لیے دیے رہنے کی عادی تھی۔ شجاع کی خاموشی نے رقیہ کو بھی بہت کچھ سمجھنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس وقت وہ بھی کمرے میں موجود تھیں۔ انہوں نے بھی شارم کے کہنے پر بابا جان کو شجاع کے لیے راضی کیا تھا۔ وہ شجاع کے سامنے چور سی بنی بیٹھی تھیں۔ ایک بھائی کا مان رکھ رہی تھیں تو دوسرے کا دل ٹوٹ رہا تھا۔

کچھ دیر کے لیے کمرے میں سکوت سا چھا گیا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے کہ شجاع نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا جان' جو فیصلہ آپ نے کرلیا ہے' وہ مجھے منظور ہے" اتنا کہہ کر وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر چلے گئے۔

○☆○

بہت سارے بے کیف سے دن گزر گئے تھے۔ گھر کے ماحول پر ایک تناؤ سا چھایا ہوا تھا۔

شارم زیادہ تر گھر سے باہر رہتے اور شجاع اپنے کمرے میں بند۔ شجاع کو تو یوں بھی ہمیشہ سے عادت تھی کمرے میں بند رہنے کی۔ سب میں گھل مل کر بات وہ بہت ہی کم کیا کرتے تھے۔ زیادہ وقت ان کا مطالعے ہی میں گزرتا تھا۔ دنیا بھر کی کتابوں کا ایک ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ وقت کمرے ہی میں رہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جو کچھ ان کے دل پر گزری تھی اسے کسی نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

گھر میں شجاع کی شادی کی تیاریاں بڑی تیزی سے جاری تھیں۔ شجاع کی شادی کی خبر نے جہاں قرینہ کو دکھ پہنچایا تھا وہیں سعیدہ کو بھی زبردست دھچکا لگا تھا۔ رئیسہ بیگم سے انہوں نے تمام رشتے توڑ دیے تھے۔ دونوں گھرانوں میں اچھی خاصی کشیدگی پھیل گئی تھی۔ سعیدہ کے شوہر اظہر احمد نے انہیں تاکید کردی تھی کہ وہ رئیسہ بیگم کے گھر میں قدم نہیں رکھیں گی اور نہ وہ لوگ ہمارے گھر آئیں گے۔ سعیدہ' شوہر کی اس پابندی پر کوئی احتجاج نہ کرسکی تھیں کیونکہ بات ہی ایسی تھی کہ بچپن سے وہ سب کے سامنے یہی کہتی آئی تھیں کہ قرینہ کو تو رئیسہ آپا نے پیدا ہوتے ہی شجاع کے لیے مانگ لیا تھا اور یہ بات درست بھی تھی۔ خود رئیسہ بیگم کو یہ رشتہ توڑنے کا بہت رنج ہوا تھا مگر وہ کرامت حسین کے فیصلوں کے آگے خاموش تماشائی بن گئی تھیں۔

شجاع کی شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ ایک ہفتے پہلے ہی ڈھولک رکھ دی گئی تھی اور ایرج اور تمام کزنز نے مل کر خوب ہلہ گلہ مچایا ہوا تھا۔

شجاع کو یہ سارے ہنگامے ناگوار گزر رہے تھے مگر وہ بہنوں کی خواہش' اماں ابا کی امنگوں کے سامنے بے بسی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سنجیدہ طبیعت کے تو وہ پہلے تھے مگر حالات نے کچھ اور ہی انہیں سنجیدہ سا بنا دیا تھا۔ چہرے پر تمام کوشش کے باوجود افسردگی نمایاں نظر آرہی تھی۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزار رہے تھے۔ کہیں کوئی ان کے دل کا چور نہ پکڑ لے۔ گھر آئے' ماموں ممانی' پھوپیاں وغیرہ سب ہی کو ان سے گلہ تھا کہ شادی سر پر ہے اور وہ دو گھڑی کسی کے پاس بیٹھتے ہی نہیں ہیں۔ ادھر آئے ادھر چلے گئے۔ کزنز چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ہولے سے زبردستی مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے اور ایسے لمحے میں شارم شرمندہ سا ہو جاتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ مطمئن ہو کر سوچتا۔ اس میں شجاع بھائی میرا کیا قصور ہے' سارا کیا دھرا بابا جان کا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے صاف اپنے آپ کو بچا لیتے۔ مگر وہ خود بھی یہ جان کر بہت دکھی ہوا تھا کہ شجاع نے اس کی خاطر قرینہ سے بے وفائی کی تھی۔ اپنی محبت کی قربانی دی ہے۔ وہ خود بھی یہ سب جان کر اتنا اپ سیٹ ہو گئے تھے کہ شجاع کی شادی کو ٹھیک طرح سے انجوائے بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ ان دنوں یوں بھی پریشان تھے کہ نشا سے اس کی فون تک پر بات نہیں ہو سکی تھی۔ رقیہ نے بتایا تھا کہ اتفاق تھا کہ نشا کا جتنی بار بھی فون آیا' ریسیور کرامت حسین نے ہی اٹھایا تھا۔ شارم کا نام سنتے ہی وہ ریسیور پٹخ دیتے اور .. شارم جتنی بار بھی فون کرنے کی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کوشش کی ہر بار یا تو فون انگیج ملتا یا پھر نشا کی ماں رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیتی تھیں۔

نشا کا ساتھ چار سال پرانا تھا مگر کبھی نشا کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نشا کا کہنا تھا کہ میرا تعلق تو ایک برگر فیملی سے ہے مگر اس معاملے میں میری ماں کے خیالات پچاس سال پرانے ہیں۔ اس لئے ا یں پہلے رشتہ لے کر اپنی فیملی کو بھیجنا ہوگا اس کے بعد ہی تمہاری ملاقات مما اور ڈیڈی سے ہو سکے گی۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑا نشا کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ شجاع بھائی کی شادی سے فارغ ہو لوں تو نئی نویلی بھابی اور شجاع بھائی کو لے کر نشا کے گھر جاؤں گا۔ گھر کا خیال آتے ہی اسے ایڈریس کا خیال آیا۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے گھر کے ایڈریس سے ناواقف تھے۔ کوئی بات نہیں' نشا کو فون کر کے معلوم کر لوں گا۔ یہی سوچ کر اس نے نشا کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو!" ایک نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"سنئے میں شارم بات کر رہا ہوں۔ نشا سے بات کرا دیجئے' آپ کون؟"

شارم نے کریدا۔

"میں ان کی کزن ثنا بات کر رہی ہوں آپ نے کیا نام بتایا تھا؟ ادھر آواز صاف نہیں آ رہی ہے۔ شادی کا گھر ہے' شور بہت ہے۔"

"جی کیا کہہ رہی ہیں آپ' میں شارم ہوں۔ کس کی شادی ہو رہی ہے؟" شارم کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ دوسرے لمحے لائن کٹ گئی تھی۔ وہ نمبر ڈائل کرتا رہا۔ بے سود شادی کا گھر ہے' شور بہت ہو رہا ہے' آپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"نہیں' نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی جلدی کیسے؟" وہ آپ ہی آپ بدبدایا۔

"او' آئی سی!" پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ نشا نے ایک بار بتایا تھا' اس کی ایک دور کی کزن اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ماں باپ کا انتقال کچھ عرصے پہلے ہو گیا تھا جب سے وہ نشا کے گھر میں رہ رہی تھی اور اس کی مما اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں' جلدی ہی اس کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ نشا کی بتائی ہوئی بات یاد آئی تو جیسے ایک بوجھ ہلکا سا ہو گیا۔ اس کی شادی ہوگی اور اسی لیے نشا کئی بار فون کر چکی ہے مگر بابا جان!" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر رہ گیا۔ مطمئن ہونے کے باوجود وہ اندر ہی اندر اتنا غیر مطمئن تھا۔

شجاع کی مہندی گئی تو وہ گھر پر ہی رک گیا تھا۔ سب نے بہت کہا مگر وہ بہانے بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مہندی آئی تو ادھر خوب ہلہ گلہ رہا۔ شارم نے بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا کیونکہ مہندی میں نہ جانے کی وجہ سے اریج نے شارم کی خوب خبر لی تھی کہ اسی کی وجہ سے وہ لوگ ہار گئے تھے۔ وہ ہوتا تو مقابلہ جیت جاتے۔ اریج نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ شارم کو بھی اپنے نہ جانے کا افسوس ہوا۔

کوٹھی رنگین روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ گھر کے تمام کمرے گلاب کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ کرامت حسین نے تمام کمروں کی چوکھٹ کو تازہ گلاب کی لڑیوں سے سجوایا تھا۔ دلہن کا کمرا تو دیکھنے کے قابل تھا۔ شارم نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر بہت حسین سیج سجائی تھی۔ اسٹیج پر تازہ گلاب ہی گلاب تھے۔

دلہن کے اعلیٰ قیمتی فرنیچر کو اس نے کشادہ کمرے میں میرون مخملی کارپٹ پر بہت قرینے سے سیٹ کیا تھا۔

دلہن رخصت ہو کر آ گئی تھی۔ شجاع' دلہن چاندنی کے ساتھ اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کزنز اور بہنوں' رشتے داروں کے ہجوم میں گھرے کھڑے تھے۔ چاندنی کا گھونگھٹ بہت لمبا تھا۔ سب ہی دلہن کو ایک نظر دیکھنا چاہ رہے تھے۔ شارم بھی اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ان کی ممانی نے کہا۔

"نہیں شارم' ہمارے گھر کی رسم کے مطابق دولہا سے پہلے کوئی دلہن کو نہیں دیکھے گا۔ منہ دکھائی کی رسم صبح ہو گی۔"

"لیجئے شارم بھائی' اطمینان سے صبح کا انتظار کیجئے' ان کے درشن کرنے کو" اریج نے دلہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو رئیسہ بیگم بولیں۔

"بیٹا شجاع! بہنوں کو چوکھٹ کا نیگ دے کر دلہن کو اندر لے چلو" اسی وقت شجاع نے کوٹ کی جیب سے ایک بھاری لفافہ نکال کر رقیہ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ آپ سب بانٹ لینا۔"

انہوں نے اریج وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اریج بولی۔

"کتنی جلدی ہے دلہن کو اپنے کمرے میں لے جانے کی کہ فوراً ہی ہمارا حق دے دیا۔"

"اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ' راستہ دو اندر جانے کا" شارم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"اف توبہ' ان کو بڑی جلدی ہے۔ جیسے ہی دلہن اندر کمرے میں چلی جائے گی تو انہیں دیکھنے کا چانس مل جائے گا" وہ کہتے ہوئے سب کے ساتھ دلہن کو لیے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

دلہن کا گھونگھٹ یونہی نیچے تک گرا ہوا تھا۔

"بھئی اریج' کہیں نہ کہیں سے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہماری بھابی کا چہرہ تو نظر آ ہی جائے گا" وہ بڑے شوخ انداز میں کہتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ نہ جانے دلہن کو کیا ہوا کہ وہ ایسی چکرائی کہ اوندھے منہ بیڈ پر گر گئی۔ شجاع بری طرح گھبرا گئے۔ شارم تیزی سے آگے بڑھا۔

"شجاع بھائی' انہیں سیدھا تو کریں اور گھونگھٹ الٹ دیجئے' اچھی خاصی گرمی ہے۔ دم گھٹ رہا ہو گا۔"

"چلو باہر نکلو سب' آج گرمی بھی اچھی خاصی ہے" شارم نے کہا تو رئیسہ بیگم نے لڑکیوں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اسی لمحے شجاع نے دلہن چاندنی کو سیدھا کرتے ہوئے آہستہ سے گھونگھٹ الٹ دیا۔

شارم کے قدموں کے نیچے زمین ہچکولے کھانے لگی۔ نشا اس کی محبت اس کی چاہت' دلہن کے حسین روپ میں اس کے سامنے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ پلکوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے' ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ شاید اس کی آواز پہچان کر وہ کرب کی اذیت سے گزر رہی تھی۔

سب شارم کے دل کی کیفیت سے بے خبر' دلہن کی طرف متوجہ تھے۔ دلہن کو ہوش میں لانے کے لیے رئیسہ بیگم پانی کا چھینٹا مار رہی تھیں۔ جبھی دلہن نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ کئی موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر پھیل گئے تھے۔

شارم تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ملال کی لکیریں... پھیل گئی تھیں۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

شادی کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔ زندگی نشا اور شارم کو ایک نئے موڑ پر لے آئی تھی۔ ایک ایسے موڑ پر جہاں زندگی کا ہر لمحہ زندگی کے کٹھن پل صراط سے گزرنے سے کم نہیں تھا۔ وہ دونوں پیار کی بازی ہار گئے تھے۔ شارم نے خود ہی انجانے میں اپنے ہاتھوں میں کانٹے چبھو لیے تھے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ نشا شیخ افضل کی بیٹی چاندنی ہے۔ نہ کبھی رشتے کے دوران یہ ذکر سامنے آیا تھا کہ چاندنی کا پورا نام نشا چاندنی ہے۔ گھر والے تو سب ہی صرف چاندنی کے نام سے واقف تھے۔ چاندنی نے اپنا نام تعلیم کے دوران تبدیل کر کے نشا شیخ رکھ لیا تھا۔ اس بات کا انکشاف تو شادی کے بعد ہوا تھا۔ مگر یہ بات خاص کر اس نے شجاع سے بھی چھپائی کہ تعلیمی ادارے میں اس کا نام نشا شیخ تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کوئی یہ نہ جان لے کہ وہی نشا ہے جس کی محبت میں، جس کو حاصل کرنے کے لیے شارم نے چاندنی کو ناپسند کیا تھا۔

○☆○

وقت کا پہیہ دن اور رات کے گرد گھومتا ہوا تیزی سے گزرنے لگا۔ شجاع کی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں۔ شارم نے اس دوران نشا کا سامنا بہت کم کیا تھا۔ ایک دن بھی وہ رات کے کھانے پر ان سبھوں کے ساتھ نظر نہیں آیا تھا۔ صبح وہ اتنی دیر تک سوتا رہتا جب تک یہ لوگ ناشتے سے فارغ نہ ہو جاتے۔ رات گئے گھر آتا جب سب اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے جاتے۔ رئیسہ بیگم اس کی اس تبدیلی کو بڑی گہری نظروں سے نوٹ کر رہی تھیں۔ نشا خود شارم کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ اگر وہ بھی ایک دم سامنے آجاتا تو وہ تیزی سے نظریں چرا جاتی۔

نشا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور لہجے کی شوخی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ بہت خاموش خاموش سی کرب کی اذیتوں سے گزرتی ہوئی تقدیر کی ستم ظریفی سے سمجھوتا کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ وہ کوئی احتجاج بھی نہ کر پائی تھی۔

آج اتفاق ہی تھا کہ شارم ان سبھوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر رات کے کھانے میں موجود تھا۔ اس کے سامنے والی چیئر پر نشا اور شجاع بیٹھے تھے۔ نشا نظریں چرائے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھی۔

رقیہ نے پہلا لقمہ چکن روسٹ کا لیتے ہوئے کہا "کھانے کی خوشبو بتا رہی ہے کہ کھانا لذیذ ہے۔" شارم نے آہستہ سے رسمی انداز میں کہنا ضروری سمجھا کہ کوئی اس کی خاموش اداسی کو محسوس نہ کرے۔

نشا نے ایک نظر اس پر ڈالی وہ کتنا اجڑا اجڑا سا نظر آرہا تھا۔

وہ سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو وہ بھی اپنے ہاتھ نیپکن سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"بابا جان! میں آج آپ سب کے لیے ایک سرپرائز لے کر حاضر ہوا ہوں" اس نے کہا تو سب ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھئی کیسا سرپرائز! جلدی بتاؤ" رقیہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"بابا جان! میں کل کی فلائٹ سے کیلی فورنیا جا رہا ہوں۔ اسٹرکچرل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کرنے۔"

"کیا کہا تم نے؟ تم ملک سے بار جا رہے ہو۔ میں تمہاری ماں اتنے غیر اہم ہو گئے کہ تم صرف ایک دن پہلے بتا رہے ہو۔ میں تمہیں ہرگز جانے نہیں دوں گی۔"

"جانے دو رئیسہ بیگم! اگر یہ ہماری دولت کی ناقدری کرنا چاہتا ہے تو کرنے دو اسے۔ بڑا گھمنڈ ہے کہ یہ کیلی فورنیا سے اسٹرکچرل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد اپنی فرم چلائے گا۔ بیٹا باہر جاؤ گے تو اپنے وطن کی قدر معلوم ہوگی۔ وطن کیا چیز ہوتی ہے۔ شجاع پہلے ہی مسقط میں مقیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی چھٹیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ واپسی کے لیے وہ بھی تیار ہیں، تم بھی چلے جاؤ تو میری فرم کا سارا بوجھ میرے کندھوں پر آ ل کر" کرامت حسین بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شارم بھی اٹھ کر باہر چلا گیا۔

شارم کے جانے کے بعد شجاع بولے "اگر شارم جانا چاہ رہا ہے تو اسے جانے دیں۔ آخر اس میں ہرج بھی کیا ہے۔ کچھ سالوں کی تو بات ہے۔ واپس لوٹ کر اسے وطن ہی آنا ہے اور پھر شادی بھی تو اس کی اسی لڑکی سے کرنی ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ رقیہ، تم شارم سے بات کرنا۔ بھئی اس لڑکی کا کیا ہوا جس کی خاطر اس نے بابا جان کی زبان کا پاس بھی نہیں کیا تھا اور اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی شادی ہو جائے تو پھر بھابی کو اور آپ کو لے کر جاؤں گا۔"

"پتا نہیں شجاع بھائی! آج کل تو وہ باہر جانے کے چکر میں اتنا مصروف رہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ آج پہلی بار اتنے عرصے میں رات کے کھانے پر موجود نظر آیا ہے۔ وہ بھی میں نے تاکید کی تھی کہ آج جلدی آجانا۔"

"چاندنی! ایک کپ چائے بوا سے کہہ کر بنوا دیجیے" انہوں نے کہا تو چاندنی فوراً ہی اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھی پھر شجاع بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے۔

اب ڈائننگ روم میں صرف رقیہ اور رئیسہ بیگم موجود رہ گئی تھیں اور رقیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

رقیہ! شارم سے معلوم تو کرنا اس لڑکی کا کیا ہوا جس کی خاطر میری سگی بہن سے اتنی کشیدگی بڑھ گئی کہ نہ وہ لوگ شادی میں شریک ہوئے۔ میں نے فون پر بھی بات کرنا چاہی تو سعیدہ نے لائن کاٹ دی، میری آواز سنتے ہی۔ اگر شارم مان جاتا تو مجھے اپنی بہن کے سامنے یوں شرمندہ ہونا نہیں پڑتا۔ اس کے انکار سے اتنی رنجش بڑھ گئی۔"

چاندنی باہر چائے کی ٹرے لیے سب کچھ سن کر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ شارم ہمارا ملن ایک غلط فہمی کی نذر ہو گیا۔ وہ سوچتی ہوئی ڈائننگ روم میں آگئی۔ اس نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر چائے کا کپ اٹھا کر رئیسہ بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

"بابا جان، چائے پئیں گے، رقیہ آپا؟" چاندنی نے پوچھا تو رقیہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"لائیے بھابی، میں دے آتی ہوں بابا جان کو۔ آپ شجاع بھائی کا کپ لے جائیے اپنے کمرے میں گئے ہیں۔"

چاندنی چائے کے دو کپ لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

○☆○

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

آج وہ کہیں نہیں گیا تھا۔ اپنے کمرے میں ضرورت کی چیزیں سوٹ کیس میں رکھ رہا تھا۔ شجاع کرامت حسین کے ساتھ ان کے آفس گئے تھے۔ آج کرامت حسین انہیں خود ہی ساتھ لے گئے تھے۔ فائزہ کالج جاچکی تھیں۔ رئیسہ بیگم کے کمرے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ بوا کلثوم کچن میں لگی ہوئی تھیں۔ نشا نے سب کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شارم سے بات کرنے کا ارادہ کرکے اس کے کمرے کی طرف آکر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

"بھئی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دستک کی کیا ضرورت ہے۔ رقیہ آپا' آجایئے" شارم نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دوسرے لمحے اس کے سامنے تھی۔

"تم..... کا مطلب ہے آپ؟" وہ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

"شارم! گھر سے فرار کیوں حاصل کررہے ہو؟ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں تمہاری لاعلمی کا بڑا دخل ہے۔ میں تو تمہیں فون پر سب کچھ بتانا چاہتی تھی مگر تم کبھی فون پر ملے ہی نہیں اور تم نے تو پلٹ کر ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ بتاؤ' میں کیا کرتی۔ تم نے تو خود انجانے میں اپنی خوشیاں اپنے بھائی کی جھولی میں ڈال دیں تو اب ملال کس بات کا ہے۔ ملک سے باہر جاکر کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ اچانک یوں ملک چھوڑ کے جانے سے کیا تم سبھوں کو شک میں مبتلا نہیں کررہے ہو؟"

"نشا پلیز' تم میرے کمرے سے چلی جاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ یہ صحیح ہے جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں سارا قصور میرا ہے مگر میں تمہیں اس روپ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ تم میرے اس عزیز بھائی کی امانت بن گئی ہو جس نے میری خاطر بڑی قربانی دی ہے۔ نشا میں نہیں چاہتا کہ میں یہاں رہ کر انہیں کسی قسم کا کوئی دکھ دوں۔ سامنے اس گھر میں رہا تو حقیقت کھل جائے گی۔ میں تمہیں بھابی نہیں کہہ سکتا' یہی ایک راستہ ہے فرار کا۔ مجھے پتا ہے اماں اور بابا جان کو میرے جانے کا بہت دکھ ہوگا مگر نشا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ غلطی تو تمہاری بھی ہے تم نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں تھا کہ نشا تمہارا نام صرف تعلیمی ادارے میں درج ہے' اصل میں تم چاندنی شیخ ہو۔"

"ہاں شارم کبھی کبھی ہماری ذرا سی کوتاہی عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے" اس نے بہت تیزی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا اور وہ بے قدموں کمرے سے باہر آگئی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر بہت دیر تک روتی رہی۔

شارم کی تیاری مکمل تھی۔ شجاع اور کرامت حسین بھی آج جلد ہی آفس سے اٹھ آئے تھے۔ شارم کو جو سی آف کرنے جانا تھا۔

"ارے چاندنی! آپ تیار نہیں ہوئیں' سب تیار ہیں۔ شارم کو سی آف کرنے ائرپورٹ نہیں چلنا ہے؟" انہوں نے اسے یوں بیٹھا دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا اور رقیہ بولیں۔

"ارے بھابی' میں تو سمجھ رہی تھی' آپ تیار ہوگئی ہوں گی" اس نے شارم کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جارہی۔ آپ لوگ چلے جائیں۔ میرے سر میں درد ہورہا ہے اور ویسے بھی مجھے کسی کو سی

آف کرنے جانا اچھا نہیں لگتا۔ واپسی پر دل اداس ہوجاتا ہے۔ جب شارم کامیابی کی ڈگری لے کر واپس لوٹیں گے تو میں ضرور جاؤں گی" نہ جانے کتنی اذیتوں سے گزرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تو شارم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

شارم کیا گیا گھر میں ایک اداسی سی پھیل گئی تھی۔

"امی مجھے لگتا ہے' اس لڑکی کے ساتھ کچھ ٹریجڈی ہوگئی ہے جس کو شارم پسند کرتا تھا۔ آپ نے دیکھا نہیں جاتے وقت وہ کتنا اداس تھا" رقیہ نے کہا تو سامنے ہی رئیسہ بیگم کے قریب بیٹھی چاندنی کا دل اچھل کر حلق میں گیا۔ اسے ایک دم کھانسی ... آگئی۔

"پانی پیو چاندنی! پھندا نہ لگ جائے۔"

"نہیں' بس ایسے ہی کچھ خراش سی گلے میں محسوس ہورہی ہے" وہ اٹھ کر رئیسہ بیگم کے کمرے سے باہر آگئی۔ وہ بہت بے کلی سی محسوس کررہی تھی۔ شجاع کا رویہ اس کے ساتھ شروع سے سرد سا تھا۔ کہنے کو وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے' باہر بھی وہ کئی بار ان کے ساتھ ڈنر پر گئی تھی مگر اس نے یہ بات شروع دنوں ہی میں محسوس کرلی تھی کہ شجاع کے انداز میں وہ جوش' وہ جذبات نہیں تھے جو شادی کے شروع دنوں میں ساری زندگی کی یادگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی تو خوش نظر آنے کی کوشش میں ناکام رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دونوں زبردستی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کررہے تھے جس میں نہ کوئی امنگ تھی' نہ کوئی خوشی' نہ خواہش' زندگی کا یہ نیا سفر بڑے پھیکے انداز میں رواں دواں تھا۔

اس نے شارم کی تمام یادوں کو ذہن سے کھرچ ڈالا تھا۔ وہ صرف شجاع کی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ ایک مشرقی عورت کی طرح مشرقی بیوی ثابت ہونا چاہتی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس میں کامیاب ہوگئی تھی۔ شجاع نے اپنی چھٹیاں بڑھوالی تھیں۔

ادھر شیخ افضل کا اصرار تھا کہ شجاع مسقط کی ملازمت چھوڑ کر ان کے بزنس کو سنبھال لے۔ کرامت حسین نے سنا تو شجاع کو یہی مشورہ دیا کہ وہ شیخ افضل کی آفر کو قبول کرلے۔ اس طرح وہ اپنے اور شیخ افضل کے بزنس کو مشترکہ طور پر ڈیل کرسکے گا۔

شارم کے ملک سے باہر جانے کے بعد کرامت حسین خود بھی یہی چاہتے تھے کہ شجاع واپس ملازمت پر مسقط نہ جائیں مگر وہ ایسا کہہ نہیں سکتے تھے۔ مگر جب شیخ افضل کے ارادے کے بارے میں شجاع نے بتایا تو انہوں نے یہی کہا کہ بیٹا تمہیں اس آفر کو بخوشی قبول کرلینا چاہیے۔

اور پھر شجاع نے مسقط کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہ کرامت حسین اور شیخ افضل کے بزنس کو بڑی خوبصورتی سے ڈیل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

شارم کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے' اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ شجاع نے بابا جان اور افضل انکل کا بزنس سنبھال لیا ہے۔ وہ اپنے خط میں چند ضروری باتوں کے علاوہ کوئی اور بات نہیں لکھتا تھا۔ چند سطروں کا رسمی سا خط دیکھ کر رئیسہ بیگم اداس سی ہوجاتیں۔ ○☆○

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وقت بڑی تیزی سے پرواز کر گیا تھا۔ شجاع کے گلشن میں دو پھول روبا اور جنید کی صورت میں مسکرا رہے تھے۔

شارم کو گئے چھ سال کا عرصہ دبے پاؤں گزر گیا تھا۔

اس دوران میں ان کی کوٹھی میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ فائزہ کی شادی ہو گئی تھی۔ رقیہ کو تو قیصر نے جرمنی بلا لیا تھا۔ کرامت حسین کو دمے کی بیماری نے ایسا گھیرا تھا کہ وہ بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ رئیسہ بیگم بہت زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ تو بچوں کی وجہ سے دل کو بہلانے کی لاکھ کوشش کرتیں مگر شارم کی دوری نے انہیں بہت ہراساں سا کر دیا تھا۔ وہ تو یہ آس لگائے دن گنتی رہی تھیں کہ شارم کیلی فورنیا سے اسٹرکچرل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ آئیں گے مگر شارم نے واپس آنے کا ارادہ ترک کر کے وہیں اپنی ذاتی فرم قائم کر لی تھی۔ ایک بڑی مخصوص رقم وہ بڑی پابندی سے ہر ماہ بھیجتے رہے تھے۔

کرامت حسین کی بیماری کی وجہ سے شجاع کے کندھوں پر بزنس کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مگر اس نے بڑی خوبصورتی سے ایکسپورٹ کے اس بزنس میں بہت زیادہ نمایاں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ چاندنی کو شروع سے باپ کے بزنس سے دلچسپی تھی اس لیے اس نے شجاع سے کہا بھی کہ وہ ہر طرح ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے مگر شجاع کو یہ پسند نہیں تھا کہ چاندنی آفس جوائن کرے۔ اس طرح بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی مسئلہ بن جاتا اور پھر ماں کا انہیں بہت خیال تھا کہ وہ سارا دن تنہائی میں اکیلی بور ہوں گی۔

بابا جان اجازت ویسے بھی نہیں دیتے۔ انہوں نے یہی سب کچھ سوچ کر چاندنی کو بڑی خوبصورتی سے ٹالتے ہوئے کہا "نہیں چاندنی، جب عورت گھر سے باہر رہتی ہے تو گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ نوکروں پر گھر اور بچوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"شجاع! جیسی آپ کی مرضی۔ میں نے تو یونہی اپنا خیال ظاہر کیا تھا" چاندنی نے آہستہ سے کہا تو شجاع خاموش رہے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ہاں یاد آیا۔ کل صبح مجھے دو دن کے لیے بزنس کے سلسلے میں مسقط جانا ہے۔ ہمارے مسقط والے آفس میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور لگتا ہے یہ ساری گڑبڑ ہمارے آفس کے نئے منیجر نے کی ہے۔"

"اچھا تو آپ صبح کی فلائٹ سے جا رہے ہیں۔ مگر مجھے کل امی کی طرف جانا تھا۔ فریحہ آپا امریکا سے آئی ہیں۔ صبح ہی ان کا فون آیا تھا اور اتفاق سے فریحہ کے بیٹے نعمان کی برتھ ڈے بھی کل ہے۔"

"مجھے تو جانا ہو گا شجاع" چاندنی نے تفصیل سے بتایا تو وہ بولے۔

"ہاں تو چلی جایئے گا۔ شام کو جانا ہے نا۔ مگر چاندنی رکنا نہیں، رات کو ہی واپس آ جانا۔ بابا جان اور امی اکیلی ہوں گی نا۔" شجاع نے کہا۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ کیا مجھے نہیں پتا۔"

"مجھے پتا ہے چاندنی تم تو بابا جان اور امی جان کا بہت خیال رکھتی ہو مگر میں نے تو یونہی کہہ دیا ہے۔ تم خود

یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھتی ہو۔"

"جی جناب! جبھی تو کہہ رہی ہوں آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف ایک گھنٹے کے لیے جاؤں گی، اوکے" اس نے ہولے سے مسکرا دیے کہا تو شجاع کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شجاع صبح سات بجے ہی چلے گئے تھے۔ آٹھ بجے کی ان کی فلائٹ تھی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر کچن میں کھڑی دوپہر کے کھانے کے بارے میں بوا کلثوم کو بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی "بوا کلثوم! بابا جان کے لیے دوپہر میں دلیہ بنے گا" وہ یہ کہتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں آ گئی جہاں رئیسہ بیگم اور کرامت حسین بیٹھے صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ ابھی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک خصوصی بلیٹن شروع ہو گیا۔ ان تینوں کی توجہ ٹی وی کے اسکرین پر جمی ہوئی تھیں "یا اللہ خیر، کیا ہو گیا جو...؟" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جیسے اس کے ہوش اڑ گئے۔

"آج صبح آٹھ بجے پرواز کرنے والا طیارہ جو کراچی سے مسقط کے لیے روانہ ہوا تھا، کسی فنی خرابی کی وجہ سے گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ جہاز میں تیس مسافر سوار تھے جن میں کسی کے بچنے کی امید نہیں ہے۔"

اسکرین پر جہاز کے تباہ ہونے کے بعد شعلے ہی شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ رئیسہ بیگم کی دل خراش چیخ میں چاندنی کی چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں "نہیں، نہیں۔ وہ بے اختیار رو رہی تھی۔

○☆○

چاندنی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ رئیسہ بیگم جوان بیٹے کے غم میں ہوش سے بے گانہ ہو گئی تھیں۔ کرامت حسین کا حوصلہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے مگر بڑے حوصلے سے چاندنی کو حوصلہ دے رہے تھے۔

پل میں شجاع خاک میں مل گئے تھے۔ شارم یہ دردناک خبر سنتے ہی پہلی فلائٹ سے پاکستان آ گیا تھا۔ شجاع کے یوں چلے جانے پر غم سے بے حال ہو رہا تھا۔ ہنستے بستے گھر میں ویرانیاں سی پھیل گئی تھیں۔ چاندنی سفید چادر اوڑھے بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ دونوں بچے سہمے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ پانچ سالہ روبا اور تین سالہ جنید چاندنی کے نزدیک گم صم سے بیٹھے تھے۔

شارم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاندنی کو کیسے حوصلہ دے۔ سر جھکائے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

وقت بڑا مرہم ہوتا ہے۔ زخم کو بھر دیتا ہے مگر کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو بھر جانے کے باوجود کہیں نہ کہیں سے رستے رہتے ہیں۔ چاندنی کے کچھ زخم ایسے ہی تھے جو بھر جانے کے باوجود کہیں نہ کہیں سے رستے رہتے ہیں۔ تقدیر نے اس کو شارم کے بجائے شجاع کے نصیب میں لکھ دیا تو اس نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر حالات سے سمجھوتا کر لیا مگر شاید تقدیر کو اس کا یہ سمجھوتا ہی پسند نہیں آیا کہ جب وہ اپنی پچھلی زندگی کا باب بند کر کے صرف شجاع کی وفادار بن گئی تھی تو تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے شجاع کو اس سے چھین لیا تو نئے پرانے سب زخم رِسنے لگے تھے۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وہ بالکونی میں کھڑی اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے دور دور بکھرے ہوئے تاروں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی جبھی اس نے دیکھا اچانک آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور لڑھکتا ہوا بادلوں میں غائب ہوگیا "میں بھی تو ایک ٹوٹا ہوا تارا ہوں" وہ اداسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ دسمبر کی اندھیری رات بڑی خوف ناک سی لگ رہی تھی۔ اس کے من کے اندر بھی اتنا ہی خوف ناک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔

وقت بڑی برق رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اس کی عدت کے دن پورے ہوئے تو شیخ افضل اور زاہدہ بیگم اسی شام اسے لینے آگئے۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کرامت حسین' رئیسہ بیگم' شارم اور چاندنی سب ہی موجود رہے تھے۔ دونوں بچے ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شیخ افضل نے بات شروع کی "کرامت حسین' میں چاندنی کو لینے آیا ہوں۔ اب اس کی عدت پوری ہوگئی ہے" انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا تو کرامت حسین بولے۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ چاندنی بیٹی ہفتہ پندرہ دن کے لیے چلی جاؤ۔ تمہارا بھی دل بہل جائے گا۔"

"یہ بات نہیں ہے کرامت بھائی۔ میں چاندنی کو ہمیشہ کے لیے لے جانا چاہتی ہوں" زاہدہ بیگم نے کہا۔

شارم نے ایک دم چونک کر چاندنی کی طرف دیکھا جو بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں زاہدہ آپا' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ بچے تو میرے شجاع کی نشانی ہیں" رئیسہ بیگم نے تڑپ کر کہا۔

"بھئی بچوں سے آکر آپ لوگ مل لیا کیجئے گا یا بلوا لیا کیجئے گا مگر چاندنی کے مستقبل کے بارے میں تو ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"مما' یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ' یہی میرا گھر ہے' میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"چاندنی' ابھی تمہارا زخم تازہ ہے۔ تمہیں احساس نہیں ہے۔ یہ پہاڑ جیسی زندگی تن تنہا گزارنا عورت کے لیے کتنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ بیٹا' میں تمہیں یوں اجڑا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔"

"پلیز مما! نہ کریں ایسی باتیں" وہ روتی ہوئی کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

"کرامت حسین' تم خود سمجھ دار ہو۔ بتاؤ' کیا ہمارا خیال غلط ہے؟" شیخ افضل نے کہا۔

"شیخ افضل' مجھے تمہاری باتوں سے بہت دکھ ہوا ہے۔ ابھی تو شجاع کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم چاندنی کو واپس لینے آگئے ہو۔ کچھ تو صبر کیا ہوتا۔ کچھ تو مجھے بھی سوچنے دیا ہوتا۔ بہرحال مجھے سوچنے کا کچھ وقت دو۔ میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے مگر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقت درکار ہے مگر تمہیں بہت جلدی ہے تو میں تمہیں اپنے فیصلے سے کل آگاہ کروں گا اور افضل سب سے بڑی بات چاندنی کی ہے۔ مجھے یقین ہے' وہ بڑی نیک لڑکی ہے' بڑی مخلص ہے۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اگر وہ تمہاری بیٹی ہے تو میری بہو بھی ہے۔ دیکھو' وہ فیصلہ کس کے حق میں کرتی ہے" اسی وقت دونوں بچے آکر دادا سے لپٹ گئے۔

"بیٹا' آپ نے نانو کو سلام نہیں کیا" شارم نے جنید کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

"جی انکل! میں نے سلام تیا (کیا) تھا" جنید نے توتلی زبان میں کہا تو زاہدہ بیگم مسکرانے لگیں۔

"روبا بیٹا' جایئے مما کو بلا کر لایئے۔ نانو جا رہی ہیں" شارم نے کہا تو روبا بھاگ کر ماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چاندنی روبا کے ساتھ کمرے میں آگئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"مما! میں دو تین دن بعد گھر آؤں گی۔ بس دن بھر کے لیے" اس نے آہستہ سے کہا تو شیخ افضل بولے۔

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی بیٹی! ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔"

وہ لوگ چلے گئے اور رئیسہ بیگم اور کرامت حسین کو بے چین کر گئے تھے۔ چاندنی چلی گئی تو بچے بھی جدا ہوجائیں گے۔ کرامت حسین اور رئیسہ بیگم کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی جاگ رہے تھے۔

ادھر شارم بھی بے چین تھا۔ کیا نشا واپس چلی جائے گی۔ انکل شیخ کا اصرار بڑھا تو شاید وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے پر مجبور ہوجائے گی۔ بابا جان اور اماں کیسے جئیں گے بچوں کے بغیر۔ اگر انکل شیخ نے نشا کا نکاح کہیں اور کردیا تو بچے تو ماں کے ہوتے ہوئے بھی بے آسرا ہوجائیں گے۔ کیا سوتیلا باپ انہیں سچی محبت دے سکے گا؟ نہیں' نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے" وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے شجاع شدت سے یاد آرہے تھے جنہوں نے رختِ سفر باندھنے میں بڑی جلدی کی تھی۔

دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے مگر وہ ابھی تک جاگ رہی تھی "مما! اس بار فیصلہ میں خود کروں گی۔ کسی کو کیا حق پہنچتا ہے میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا" وہ خیالوں میں ماں سے مخاطب تھی۔ نہ جانے جاگتے جاگتے اور سوچتے سوچتے اس کی آنکھ کب لگ گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ بچے اسکول بھی نہ جاسکے تھے۔ وہ اٹھ کر باہر آئی تو شارم کرامت حسین کے آفس جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔

"ناشتا کرلیا" اس نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کرلیا۔ بوا نے دے دیا تھا۔ آج بچے اسکول نہیں گئے؟" شارم نے پوچھا تو وہ بولی۔

"آنکھ نہیں کھلی' الارم لگانا بھی بھول گئی تھی۔" چاندنی نے کہا تو شارم نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ بے حد سوگوار سی لگ رہی تھی۔ آنکھیں اس کی بے خوابی کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ کترا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ شارم کرامت حسین کے کمرے میں آگئے۔

"السلام علیکم۔"

"جیتے رہو بیٹا" کرامت حسین نے انہیں بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولے۔

"بابا جان' آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا" اس کا اشارہ رات والی بات کی طرف تھا۔

"شارم' کیا تم آفس جا رہے ہو؟"

"جی امی!"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"مگر بیٹا! تمہارے بابا جان تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہ رہے ہیں" رئیسہ بیگم نے آہستہ سے کہا تو وہ بولے۔

"بابا جان! شام کو کر لیجئے گا۔"

"نہیں بیٹا' میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمام رات جاگتا رہا ہوں اور سوچتا رہا ہوں تم سے کہنے کو اب اس کے لیے شام کا انتظار کرنا بڑا محال ہو گا۔ صبح کا انتظار ہی بڑی بے چینی سے کیا ہے۔"

شارم خاموشی سے ان کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گئے "کیا بات ہے؟ بابا جان کہئے۔"

"بیٹا! جلدی شیخ افضل کو بہت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں دیر ہو جائے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں" ان کے لہجے میں گہری اداسی شامل ہو گئی تھی۔

شارم خاموشی سے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کرامت حسین بھی کچھ سوچتے رہے پھر گویا ہوئے "بیٹا شارم! تمہارا باپ ایک بار پھر تمہارے لیے ایک فیصلہ کر چکا ہے۔ مگر بیٹا' اس بار انکار کرنے سے پہلے میرے فیصلے پر نظر ثانی ضرور کر لینا" انہوں نے کہا تو شارم چونک سے گئے۔

"کیسا فیصلہ؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! کبھی کبھی زندگی ہمیں بڑے کٹھن دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ ایک ایسے دوراہے پر' ایک ایسے موڑ پر جہاں کھڑے ہو کر فیصلہ کرنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔"

"شارم! میری اور تمہارے بابا جان کی خواہش ہے کہ چاندنی کا نکاح تمہارے ساتھ سادگی سے کر دیا جائے۔ اس طرح چاندنی بچوں کے ساتھ اسی گھر میں آباد رہے گی" رئیسہ بیگم نے رکے رکے لہجے میں وہ کچھ کہہ دیا جو کرامت حسین کہنا چاہ رہے تھے۔

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شارم نے کچھ کہنا چاہا۔

"بیٹا' اس میں حرج بھی کیا ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ بچے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں۔ وہ شجاع کی نشانی ہیں۔ میں انہیں کیسے چھوڑ دوں؟" کرامت حسین نے روتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"کیا آپ لوگوں نے چاندنی سے اس سلسلے میں بات کی ہے؟"

"نہیں بیٹا۔ تمہاری مرضی کے بغیر ہم اس کو کس طرح راضی کر لیتے۔ دیکھو بیٹا' تم نے اس بے وفا لڑکی کے لیے اپنی زندگی کو روگ لگا لیا۔ تمہارے بالوں میں سفیدی چمکنے لگی ہے۔ تم اس ہرجائی لڑکی کا روگ لیے باہر چلے گئے۔ میں نے نہیں روکا کہ تمہارا زخم تازہ تھا۔ میں سمجھا تھا وقت کے ساتھ تم اسے بھول جاؤ گے مگر لگتا ہے' وہ بے وفائی کرنے کے باوجود تمہارے دل میں اب بھی آباد ہے" کرامت حسین آج بہت کھل کر اس سے گفتگو کر رہے تھے۔

"بابا جان' وہ بے وفا نہیں تھی۔ لڑکیاں بے وفا نہیں ہوتیں' والدین کے فیصلوں کے آگے مجبور ہو جاتی ہیں" شارم نے آہستہ سے کہا تو رئیسہ بیگم بولیں۔

"بیٹا' جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

"امی! میرے کسی فیصلے سے پہلے آپ کو چاندنی سے ان کی مرضی معلوم کرنی ہو گی۔ کبھی کبھی تقدیر ہمیں

کس کس طرح آزماتی ہے" وہ کہتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ کس دشوار راستے سے گزر کر اس کی محبت اسے ملنے والی تھی۔ جیت کے بھی انداز نرالے ہوتے ہیں۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔

اسی وقت رئیسہ بیگم نے بوا کلثوم کو بلا کر کہا "بوا چاندنی کو بھیج دیجئے۔" بوا کلثوم دروازے سے ہی پلٹ گئیں۔

کچھ دیر بعد ہی چاندنی جنید کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو شارم کو دیکھ کر چونک گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

"آؤ بیٹی چاندنی!" رئیسہ بیگم نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ جنید کا ہاتھ تھامے ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی سی چھا گئی تھی۔ رئیسہ بیگم سوچ رہی تھیں۔ وہ بات کہاں سے شروع کریں۔ اپنے ہی ایک بیٹے کی امانت کو... دوسرے بیٹے کو سونپنے جا رہی تھیں اور یہ مرحلہ کتنا دشوار تھا۔ یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔ چاندنی کو اس گھر میں بچوں کے ساتھ آباد دیکھنے کا یہی ایک راستہ تھا۔

انہوں نے ایک نظر چاندنی پر ڈالی۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"بیٹی چاندنی! میں نے اور تمہارے بابا جان نے تمہارے لیے ایک مناسب فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے تم ہمیں مایوس نہیں کرو گی۔ میں اگلے جمعے کو تمہارا نکاح شارم سے کر رہی ہوں تاکہ تم اسی گھر میں آباد رہو۔"

"امی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"بیٹا' اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہی بات میں نے شارم کو بھی سمجھائی ہے۔"

"مجھے نہیں پتا بابا جان شارم کا کیا فیصلہ ہے مگر آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں میں شجاع کی امانت ہوں' اسی کے نام پر مرنا چاہتی ہوں۔ بابا جان' شجاع نے شارم کے باہر جانے کے بعد مجھ سے کہا تھا "چاندنی! شارم کو تم کسی طرح وطن واپس بلا لو' کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر کے اس کا گھر بسا دو اور میرے خیال میں اس کے لیے ماموں جان کی بیٹی ایرج بہت سوٹ کرے گی۔ نہ جانے محبت کی ناکامی کا روگ لیے کب تک بھٹکتا رہے گا" اور اس دن میں نے شجاع سے وعدہ کیا تھا بابا جان کہ میں شارم کو ضرور واپس بلوا کر اس کا گھر بساؤں گی۔ مگر شجاع کو تو جانے کی بڑی جلدی تھی۔ شارم تمہارے بھائی نے تمہاری محبت کے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ مجھے سب پتا ہے۔ کیا تم اپنے اس بھائی کی خاطر ایرج سے شادی نہیں کر سکتے۔ امی جان اگر قرینہ کو نہ لا سکیں تو تم ایرج کو لا کر ان کی خواہش پوری کر سکتے ہو۔ امی جان' آپ بھی تو یہی چاہتی تھیں۔ آپ کے میکے سے کوئی لڑکی اس گھر کی بہو بنے" اب وہ رئیسہ بیگم سے مخاطب تھی۔

"بیٹا! اب وہ باتیں پرانی ہو گئی ہیں۔ اسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر تمہیں غور کرنا ہو گا" کرامت حسین نے کہا تو وہ بولی۔

"مگر بابا جان' مجھے شجاع سے کیا وعدہ پورا کرنا ہے۔ کیا شارم تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟" چاندنی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو بہت عرصے بعد اس نے چاندنی کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ کتنا عزم تھا' کیسا حوصلہ تھا اس میں۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"اور بابا جان' آپ لوگ یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ میں ڈیڈی یا ممی کے کہنے پر یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہیں رہوں گی' رہی میرے تنہا زندگی گزارنے کی بات تو بابا جان' میں تنہا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ روبا ہے' جنید میرا بیٹا ہے' میرے مستقبل کا سہارا" اس نے سختی سے ننھے جنید کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

شارم کے لب آہستگی سے ہلے "نشا' میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔"

"تم نے کچھ کہا" کرامت حسین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا جان' کچھ بھی نہیں۔ فیصلہ تو ہو چکا" وہ کہتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نشا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا۔ شارم تم حاصلِ زیست نہ تھے' یہی تقدیر کا فیصلہ اور اللہ کا حکم تھا۔ تم نے مجھے شجاع سے کیا وعدہ پورا کر کے سرخرو کر دیا ہے۔ اس نے تیزی سے ہونٹ کاٹ دیے۔ دل کو اندر سے کچھ ہو رہا تھا۔ آج وہ اپنے آپ جیتی ہوئی بازی ہار گئی تھی۔ یہ اس کے دل کا نہیں' دماغ کا فیصلہ تھا۔

وہ جنید کا ہاتھ تھامے ایک نئے عزم سے کمرے سے باہر آ گئی۔

○☆○

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رازِ پنہاں

آج وہ بہت خوش تھا۔ چھوٹا سا گھر رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گھر کے سامنے بڑے میدان میں شامیانہ لگوایا تھا۔ آج اس کے اکلوتے بیٹے سلیم کا ولیمہ تھا۔ کل ہی وہ ملتان سے سلیم کی دلہن بیاہ کر لایا تھا جو اس کے ماموں کی نواسی تھی۔ خوب صورت کومل سی فیروزہ' سبز سوٹ میں شرمائی شرمائی سی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ شامیانے میں مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی' رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔

یہ ایک لوئر کلاس آبادی کا محلہ تھا جہاں اس کا دو منزلہ مکان پورے محلے میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے حق حلال کی کمائی سے یہ مکان بنوایا تھا۔ اوپر کی منزل اس نے کرائے پر اٹھا رکھی تھی۔ نیچے تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں وہ اور نوراں رہتے تھے۔ دوسرا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ تیسرا کمرا اس نے سلیم کو دے دیا تھا۔

یہ وہی کمرا تھا جس میں پچیس سال پہلے وہ بڑی چاہ سے نوراں کو بیاہ کر لایا تھا۔ آج اور کل میں بڑا فرق تھا۔

پچیس سال پہلے اس کمرے کی چھت ٹین کی چادروں کی تھی مگر آج یہ ایک پختہ مکان تھا۔ وقت کیسا دبے پاؤں گزر گیا تھا۔ پچیس سال کا ہو گیا تھا اور آج وہ اس کی دلہن لا کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ خوشی سے سرشار ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ آنے والے مہمان اسے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ ساتھ ہی نوراں کی حالت پر اظہارِ افسوس بھی کر رہے تھے۔ جو بیس سال سے ذہنی مریض بنی گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے بیٹے کی شادی سے لاتعلق' اپنے کمرے میں بند پڑی تھی۔ اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے زنجیر پہننے پر مجبور تھا کیونکہ جب بھی اس پر جنون کا دورہ پڑتا' وہ گھر کی چیزیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی تھی۔ ڈاکٹر نے کئی بار کہا تھا کہ وہ اسے پاگل خانے میں داخل کر دے مگر وہ نوراں کو وہاں بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہ بیس سال اس نے بڑی اذیت میں گزارے تھے۔ خاص کر جب ماں نے بھی رختِ سفر باندھ لیا تو وہ ہراساں ہو گیا تھا۔ ننھے سلیم کی دیکھ بھال اور نیم پاگل نوراں۔ بہت مشکل وقت تھا مگر وہ مشکل وقت بھی کسی نہ کسی طرح گزر ہی گیا تھا۔ اب گھر میں بھولا کر وہ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

آج ماں ہوتی تو سلیم کا سہرا دیکھ کر کتنا خوش ہوتی۔ ماں کا خیال آتے ہی بوڑھی آنکھوں میں ماضی گھوم کر رہ گیا۔

ماں نے اسے بڑی محنت سے پالا تھا۔ دن رات کپڑے سی سی کر اسے انٹر تک پڑھایا تھا۔ باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ باپ نے یہ تین کمروں کا کچا مکان چھوڑا تھا جو سر چھپانے کے لیے کافی تھا۔

انٹر کے بعد ہی اس نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی لیکن اس کے پاس تعلیم کی کوئی بڑی ڈگری تو تھی نہیں کہ اسے فوراً ملازمت مل جاتی۔ وہ تھک ہار کر اپنے ماموں کے پاس گاؤں چلا گیا جن کا سبزیوں کا کاروبار تھا' گو کہ اسے وہاں جانا پسند نہیں تھا' وہ شہر ہی میں رہنا چاہتا تھا پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماموں اسے کون سا کاروبار کرا دیں گے' اسے اپنے پاس ملازم ہی رکھیں گے مگر جب شہر کے دفتروں کے چکر کاٹتے' خوار ہوتے' تین سال دبے پاؤں گزر گئے تو وہ ماموں کے پاس چلا گیا۔

ماموں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ صبح فجر میں اٹھ کر ان کے ساتھ سبزی منڈی چلا جاتا' جہاں ان کی تین بڑی دکانیں تھیں۔ صبح کا گیا شام سات بجے لوٹتا تو تھکن سے جسم چور ہو رہا ہوتا۔ ایک تو اپنے شہر اور ماموں سے دور' پھر سارا دن سبزیوں کے دام بھاؤ میں لگے رہنے سے وہ الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا۔ جی چاہتا واپس کراچی چلا جائے مگر پھر اپنی بے روزگاری کا خیال آتے ہی ارادہ بدل دیتا کیونکہ ماموں اسے تین ہزار روپے ماہوار دے رہے تھے جبکہ کراچی میں تو ہزار کی نوکری بھی اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ ہفتے میں ایک بار وہ ماں سے ملنے دن بھر کے لیے آتا۔ تین گھنٹے کا سفر تھا' گویا ماں کے پاس گزارنے کے لیے اسے چند گھنٹے ہی ملتے تھے۔ ماں اس کا ایک ایک پیسہ جوڑ کر رکھ رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بیٹے کا سہرا دیکھنے کا خواب تھا' پھر اس کا بچہ کھلانے کا خواب۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا۔ ماں نے اس کے سر پر سہرا سجا دیا۔ شادی کیا تھی' بس سادگی سے نکاح تھا۔ اپنے ہی جیسوں میں لڑکی تلاش کی تھی جو روکھی سوکھی کھا کر بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔

نوراں ایسی ہی تھی' پچھلی گلی میں رہتی تھی۔ باپ پرائمری اسکول میں چوکیدار تھا' پانچ بیٹیوں کا بوجھ سینے پر دھرے بیٹھا تھا۔ نوراں سب سے بڑی تھی۔ گھر کے حالات اور تنگی کی وجہ سے پانچ کلاسیں پڑھ سکی تھی۔ ماں کا انتقال بہت چھوٹی عمر میں ہو گیا تھا اور وہ بہن بھائیوں میں لگ گئی۔ پانچ بہنوں سے چھوٹے دو بھائی تھے' شکل کی ایسی حسین تھی کہ جو ایک بار دیکھتا سر ہٹانا بھول جاتا۔ پر ایسی اچھی شکل ہونے کے باوجود کوئی مناسب رشتہ اس کے لیے نہیں آیا تھا۔ چوکیدار رحمت اس کی طرف سے بہت فکر مند رہنے لگا تھا۔ جوان بیٹیوں کے بوجھ نے اسے بے انتہا ہراساں کر دیا تھا۔ عارف کی ماں نے ڈرتے ڈرتے اس کا رشتہ مانگا تھا مگر وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھا تھا' فوراً ہی رضامندی دیتے ہوئے بولا "سنا ہے عارف کو اس کے ماموں نے اپنی دکان دے دی ہے۔"

رحمت کی بات سن کر ماں سمجھ گئی کہ یہ بات عارف نے ہی محلے میں پھیلائی ہے کہ وہ دکان پر ملازم نہیں' اپنی دکان ہے۔ کچھ سوچ کر اس نے بھی کہہ دیا "ہاں بھائی رحمت' ٹھیک ہی سنا ہے۔ یہاں تو خوار ہی ہو رہا تھا' اب وہاں کما تو رہا ہے۔"

"ہاں بہن جی' یہ تو ٹھیک ہے۔ نوکری میں کیا رکھا ہے' اب مجھے دیکھ لو' پوری زندگی گزر گئی اسکول کی چوکیداری کرتے' میں ہی جانتا ہوں سات بچوں کا پیٹ کیسے پال رہا ہوں۔ وہ تو نوراں اور زہرہ مل کر سلائی وغیرہ کر لیتی ہیں' ہمارے اسکول کی میڈم اور ٹیچر اپنے کپڑے میری بچیوں سے سلوا لیتی ہیں ورنہ اس آبادی میں کون کپڑے سلواتا ہے۔ سب کو اپنی چادر دیکھ کر ہی گزارہ کرنا ہوتا ہے۔"

"ہاں بھائی رحمت' بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ میں خود ایک درزی سے سلائی کے لیے کپڑے لاتی ہوں۔ بس جی میری بھی دال روٹی چل رہی ہے' اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ میرے ہاتھ پیر چلتے رہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے' اب اس کا گھر بس جانا چاہیے' یہی سوچ کر نوراں کے لیے رشتہ ڈالا ہے' اس کے جوڑ کی ہے' مجھے پسند بھی ہے۔

"ہاں بہن' عارف بھی میرا دیکھا بھالا لڑکا ہے' مجھے کیا دیکھنا ہے' آگے نوراں کے نصیب!"

اور یوں عارف اور نوراں کی شادی ہو گئی۔

عارف' نوراں جیسی حسین بیوی پا کر بہت خوش تھا۔ انہی دنوں زیادہ دن کی چھٹیاں کرنے پر اس کا ماموں سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ گاؤں سے نوکری چھوڑ کر واپس آ گیا۔ ماں نے اسے بہت سمجھایا کہ واپس چلا جائے' نوراں کو بھی ساتھ لے جائے۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ نوراں کی وجہ سے گاؤں کی نوکری چھوڑ آیا ہے۔ ماں کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ واپس گاؤں نہیں گیا۔

خوش قسمتی سے اسے جلد ہی ایک کمپنی میں نوکری مل گئی۔ ماں بھی خوش ہو گئی' اب بیٹا اور بہو دونوں آنکھوں کے سامنے تھے۔

پھر جیسے وقت کو پر لگ گئے' مگر اس کا آنگن سونا تھا۔ کسی بچے کی چہکار سے خالی آنگن عارف کو پراسرار سا لگتا۔ دوسری طرف ماں کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اسے دوسری شادی پر اکسانے لگی تھی۔

پانچ سال گزر گئے تھے آس کی چوکھٹ پر سر جھکائے۔ عارف نے اس سلسلے میں کبھی نوراں کو الزام نہیں دیا تھا' بس اللہ کی مصلحت سمجھتے ہوئے خاموش تھا۔ نوراں کو وہ کسی صورت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر اب گھر میں جھگڑے نے زور پکڑ لیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ غصے میں نوراں کو دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ بے چاری خاموشی سے مار کھا لیتی۔ وہ جانتی تھی عورت ہونا ہی سب سے بڑا قصور ہے۔

ایک دن وہ کمپنی سے آیا تو اس نے بتایا کہ اس کی نوکری ختم ہو گئی ہے۔ غصے میں وہ ویسے ہی چڑچڑا ہو رہا تھا ذرا سی بات پر جھگڑا ہوا اور اس نے نوراں کو دھنک کر رکھ دیا پھر بکتا جھکتا گھر سے باہر نکل گیا۔ ماں روتی ہوئی نوراں کو تسلی دینے لگی۔

"تو عارف کی باتوں کا خیال نہ کیا کر' زبان کا برا ہے پر دل سے تجھے بہت چاہتا ہے۔ بس تھوڑا چڑچڑا ہو گیا ہے۔ چل جا' اٹھ کر منہ دھو مغرب ہونے والی ہے۔" ماں نے کہا تو وہ آنسو پونچھتی ہوئی غسل خانے کی طرف

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

چلی گئی۔

ابھی نوراں نماز پڑھ کر اٹھی تھی کہ عارف واپس آگیا۔

"ارے اماں کدھر ہو۔" اس نے دروازے سے ہی آواز لگائی "او نوراں! تو بھی ادھر آجا۔" وہ کافی خوش نظر آرہا تھا۔

نوراں دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی اماں کے پیچھے چلی آئی۔ عارف صحن میں بچھی پلنگ پر بیٹھا تھا۔

"اماں ادھر میرے پاس بیٹھو' ایک خوش خبری لایا ہوں۔ ایک اللہ والی باجی ہیں' لوگوں کے بڑے کام کراتی ہیں بس ان کے آستانے پر جانے کی دیر ہے۔"

"بیٹا اب عورتیں بھی یہ کام کرنے لگیں؟"

"اماں زمانہ بدل گیا ہے' اب عورتیں' مردوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔"

نوراں نے کہا تو عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "ارے تم تو بہت اچھا بولتی ہو۔ اسی بات پر فٹافٹ کھانا لگاؤ۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے اور ہاں' کل صبح ہی تیار ہو جانا' تین گھنٹے کا سفر ہے۔"

"جانا کہاں ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"ماموں کے گاؤں کے قریب ہی ہے۔ بڑی دور دور سے لوگ آتے ہیں اور مرادیں لے کر جاتے ہیں۔ وہاں مردوں کا داخلہ بند ہے۔ ان کے آستانے میں ملازم بھی عورتیں ہی ہیں مرد کا تو گزر ہی نہیں ہے۔ اماں' تم بھی ساتھ چلو۔" عارف نے کہا۔

"نہیں بیٹا' تم دونوں چلے جاؤ۔ اتنے گھنٹے کا سفر ہے۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' اماں ہم دونوں چلے جائیں گے۔" وہ ہنس کر بولا۔

نوراں باورچی خانے میں کھڑی کھانا نکال رہی تھی۔ عارف کتنا خوش ہے۔ اسے خوش دیکھ کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ دو گھنٹے پہلے والا جھگڑا' مار پیٹ' گالیاں سب بھول گئی تھی۔ وہ یہی سوچتے ہوئے کھانے کی ٹرے لیے وہیں پلنگ پر آگئی۔ عارف پہلے ہی ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ چکا تھا۔

"کیا پکایا ہے نوراں؟"

"آلو پالک کی بھاجی!"

آج وہ اتنا خوش تھا کہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔

"اری نوراں' برتن اسی وقت دھو کر رکھ دینا' صبح سات بجے گھر سے نکل جانا ہے۔"

"ہاں تو کیا خیال ہے' ناشتا بھی اسی وقت بنا کر رکھ دوں؟" نوراں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔ اس کا موڈ دیکھ کر نوراں کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے' اماں کو ضرور لے کر چلو۔ پتا نہیں وہ اللہ والی باجی کیسی ہیں' مجھے تو اکیلے جاتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

وہ پوری بات بھی کرنے نہ پائی تھی کہ عارف کا زوردار تھپڑ اس کے گلابی رخسار کو سرخ کر گیا۔

"حرام زادی! ایسی نیک بندی کے لیے تو نے ایسے الفاظ کہے کیسے' ہر وقت اول فول بکتی رہتی ہے۔ جی چاہ رہا ہے تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں۔ دفع ہو یہاں سے' خبردار اب جو تیری زبان چلی۔"

"عارف' تو ہوش میں رہا کر۔ خواہ مخواہ ہی ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اس نے کون سی ایسی غلط بات کہہ دی تھی۔" ماں نے اسے سمجھایا تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا مگر پھر بھی وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

نوراں رات بھر روتی رہی اور جاگتی رہی۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ بہت گہری نیند میں تھی کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ارے حرام زادی رات کہہ دیا تھا کہ سویرے ہی سویرے نکلنا ہے۔ سات بج چکے ہیں اور تو ابھی تک سو رہی ہے۔ چل جلدی کر۔"

وہ خاموشی سے پلنگ سے نیچے اتر آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ برقع اوڑھ کر تیار کھڑی تھی۔ اس نے ٹھیک طرح سے چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں جو رونے اور رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

عارف نے ایک نظر اس پر ڈالی اور سر جھٹکا کر بولا "میں نے ہزار بار کہا ہے جو میں ایک بار کہہ دیا کروں' اس پر خاموشی سے عمل کر لیا کر مگر تو مانتی کہاں ہے' میرا ابھی دماغ خراب ہو جاتا ہے اور تیرے ساتھ زیادتی کر جاتا ہوں۔ آچل' اماں سے دعا لے کر چلتے ہیں' اللہ ہمیں کامیابی نصیب کرے۔"

نوراں سادہ دل عورت تھی جو عارف کے چند میٹھے جملوں سے بہل جاتی اور ساری زیادتیاں بھول کر مسکرانے لگتی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ عارف کے دو لفظوں نے اسے موم کر دیا تھا۔

وہ عارف سے محبت بھی تو بہت کرتی تھی۔ اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی مگر ایک اولاد نہ دے کر اس نے عارف کو اتنا مایوس کیا تھا کہ وہ قدم قدم پر لڑنے کے بہانے نکال لیتا تھا۔

اسے شادی کے ابتدائی چند سال یاد آنے لگے۔ کتنی محبت تھی عارف کو اس سے' کتنا خیال رکھتا تھا۔ محبت تو وہ اب بھی اس سے کرتا تھا جبھی تو مار پیٹ کر خود ہی نادم سا ہو جاتا' پچھتانے لگتا' گھر سے نکلتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا تھا' اب وہ اس کی کسی بات کی مخالفت نہیں کرے گی۔ اب اس میں عارف کی مار اور گالیاں سننے کا حوصلہ نہیں تھا اور نہ وہ اسے کھونا چاہتی تھی۔

○☆○

نوراں جب سے آستانے سے ہو کر آئی تھی' بہت خاموش تھی۔ عارف بڑی پابندی سے اسے اللہ والی باجی کے دیے ہوئے تعویذ گھول کر پلا رہا تھا مگر نوراں کی صحت گرتی جا رہی تھی پھر کچھ ہی دنوں کے بعد جب ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی خوش خبری سنائی تو عارف اور اس کی ماں خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ اب وہ نوراں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی فروٹ لیے چلا آتا اور اصرار کر کر کے اسے کھلاتا لیکن نوراں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اس کا دل کسی چیز کو نہیں چاہتا تھا اس کا یہ حال دیکھ کر عارف اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگا تھا۔

پھر ایک رات نوراں کی اچانک اتنی حالت خراب ہو گئی کہ اسے فوراً قریبی اسپتال لے جایا گیا۔ اس کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ فوری طور پر آپریشن کی تیاری کی گئی۔ ایک مشکل آپریشن کے بعد عارف نے بیٹے کی خوش خبری سنی لیکن یہ سن کر وہ حواس باختہ ہو گیا کہ نوراں ابھی ہوش میں نہیں آئی ہے۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ کومے میں چلی گئی ہے۔

سب پر یہ خبر ایک بجلی بن کر گری تھی لیکن پھر خدا کا کرم ہوا۔ ایک ہفتے کے بعد ڈاکٹروں کی کوشش اور سب کی دعاؤں سے وہ کوما سے نکل آئی تھی مگر اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے بچے کو ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر آگئی۔

عارف اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا آہستہ آہستہ وہ سب کو پہچاننے لگے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ عارف بچے کی خوشی بھی نہیں منا سکا تھا بس اسے تو نوراں کی صحت کی فکر تھی۔

اس کے اس طرح فکر مند ہونے پر ماں اکثر چڑ جاتی "ارے کیا اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہے گا۔ یہ تو گئی کام سے' پر تو تو سمجھ داری سے کام لے۔ بہت چھٹیاں ہو گئی ہیں کہیں ملازمت سے ہاتھ نہ دھونا پڑ جائے۔ بچہ پالنا آسان نہیں ہے۔ یہ نصیبوں جلی تو پلنگ لے کر پڑ گئی ہے۔ مجھ بوڑھی ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ بچے کو بھی دیکھوں اور گھر کی ذمے داری بھی سنبھالوں۔ عارف تو اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑ آ' وہیں اس کی دیکھ بھال ہو سکے گی۔ کیوں اپنی زندگی کو روگ لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ میں تیرے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں...."

"اماں چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔" وہ پہلی بار تیز لہجے میں بولا تھا۔

"ارے میری بلا سے' جو جی چاہے کر۔ اس پاگل کو رکھ کر کیا کرے گا' بول بول بتا؟" ماں الٹا اس پر برس پڑی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر کچھ سوچ کر بولا "سلیم کو میں نوراں کے میکے چھوڑ آتا ہوں' خالاؤں کے پاس سارا دن رہے گا' رات کو لے آیا کروں گا۔"

"ارے میں کیا یہاں دیواروں سے سر پھوڑوں گی؟ اس دن کے لیے پوتے کی تمنا کی تھی کہ بچے کو دوسروں کے حوالے کروے۔"

ماں رونے بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ نوراں لاتعلق سی پلنگ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ بچہ جھولے میں پڑا سو رہا تھا۔

پھر ماں نے بھی جیسے وقت اور حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ سارا دن وہ بچے کو لیے پھرتی' گھر کے کام نمٹاتی۔ عارف آتا تو وہ اماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیتا۔ نوراں کی بیماری میں کوئی فرق آنے کی بجائے اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک بار ماں وقت پر نہ دیکھ لیتی تو وہ سلیم کا گلا ہی دبا دیتی۔ وہ اسے ہاتھوں میں دبوچے قہقہے لگا رہی تھی کہ آواز سن کر ماں باورچی خانے سے دوڑی آئی اور اس کے ہاتھ سے بچے کو چھین لیا۔

شام کو عارف آیا تو ماں نے تفصیل بتائی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس مشورے کے لیے پہنچا۔ واپس آکر اس نے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنا دی۔

"ماں' اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے' اب تم بے فکر ہو جاؤ۔" اس نے نوراں کو دوا کھلاتے ہوئے کہا۔ ماں خاموش رہی' بولی کچھ نہیں۔ نوراں عجیب سی نظروں سے عارف کو دیکھ رہی تھی۔

وقت بہت تیزی سے گزر گیا تھا۔ اس نے سلیم کو پوری چودہ جماعتیں پڑھائی تھیں۔ خوش قسمتی سے بی کام کے بعد اسے ایک بینک میں جاب مل گئی تھی۔ حالات اور اچھے ہوئے تو اس نے مکان پختہ کروالیا۔

اب وہ کافی مطمئن تھا۔ سلیم کی شادی کو بھی تین سال ہو رہے تھے' تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ وہ بھی اولاد سے محروم تھا۔ عارف بہت بے چین تھا کہ اسے بھی دادا بننے کا بڑا ارمان تھا مگر اوپر والے کے یہاں سے دیر پر دیر ہو رہی تھی۔ وہ نوراں کے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ سلیم کی دلہن کو اللہ والی باجی کے پاس لے کر جانا ہو گا۔ اللہ والی باجی تو اب دنیا میں نہیں رہی تھیں مگر ان کی بہن گدی نشین بن کر ان کی جگہ پر آگئی تھیں۔ لوگ اب بھی وہاں سے مرادیں حاصل کر رہے تھے۔

اللہ والی باجی کا خیال آتے ہی بوڑھے عارف کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ سلیم کو پکارا۔ صبح کا وقت تھا' وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا' باپ کے بلانے پر وہیں چلا آیا "کیا بات ہے ابا جی؟"

"بیٹا آج آفس سے چھٹی کر لو' ہم اللہ والی باجی کے پاس چل رہے ہیں' ابھی صبح کے آٹھ بجے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر...."

"کیا مطلب ہے تیرا' بس میں نے کہہ دیا' یقیناً ہماری حاضری ہے اللہ والی باجی کے پاس' جبھی تو اچانک میرے دل میں خیال آیا۔ ہماری مراد وہیں سے پوری ہو گی۔" وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا ابا جی' میں فیروزہ سے کہتا ہوں کہ تیاری کر لے۔" یہ کہہ کر سلیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اسی وقت نوراں نے اپنی پوری طاقت سے زنجیر کو جھٹکا دیا۔ عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ اس نے جنونی انداز میں زنجیر کو جھٹکا دینا شروع کر دیا۔ عارف نے دراز میں سے نیند کی گولی نکالی اور گلاس میں پانی ڈال کر اس کے قریب آیا تو نوراں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گلاس دور جا گرا۔

"کیوں غصہ کر رہی ہے نوراں' میں فیروزہ کو اللہ والی باجی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہیں' جہاں سے تو نے مراد پائی تھی۔"

"نہیں' نہیں!"

وہ اتنی زور سے چیخی کہ عارف بری طرح گھبرا گیا مگر اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آنے لگی۔ آج برسوں بعد نوراں کی زبان کھلی تھی' اس نے کسی بات پر احتجاج کیا تھا۔ خاموشی کا قفل ٹوٹ گیا تھا۔

عارف کے دل میں امید کا دیا جگمگانے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کبھی اچانک ہی اس کی ذہنی کیفیت درست ہو جائے گی اور شاید اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔

"بول' بول نوراں تو کیا کہنا چاہ رہی ہے۔" عارف کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

"تم فیروزہ کو لے کر کہیں نہیں جاؤ گے۔ اس کا حکم ہو گا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ اللہ والی باجی کیا کرے گی۔"

"کیا بک رہی ہے نوراں' اپنی مراد پا کر منکر ہو رہی ہے۔"

"ہونہہ مراد۔ اللہ والی باجی...." وہ زور سے ہنسی "سچ سننے کا حوصلہ ہے؟ سن سکے گا' یہ کونین کی گولی سے زیادہ کڑوا سچ ہے' تیرے اندر زہر اتار دے گا۔ میں جس الاؤ میں جلتی رہی ہوں' تو تو اس کی تپش سے ہی خاک ہو جائے گا۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے' چل' لیٹ جا آرام سے۔" عارف نے اسے تھامنا چاہا۔

"میں نے کہہ دیا نا' تو اسے لے کر کہیں نہیں جائے گا۔" اس نے ایک بار پھر زنجیر توڑنے کے لیے اسے جھٹکا دیا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں' تیری تو حالت بگڑ رہی ہے' اول فول بک رہی ہے۔ اس سے تو تو خاموش ہی بھلی تھی۔" یہ کہتا ہوا وہ پلٹا ہی تھا کہ نوراں نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لگتا ہے تجھے سچ سنانا ہی پڑے گا ورنہ فیروزہ بھی جیتے جی مر جائے گی۔" نوراں نے تھکے تھکے انداز میں کہنا شروع کیا "تیرے جیسے کتنے ہی سیدھے سادے اور کمزور عقیدے کے لوگ اس اللہ والی باجی سے دھوکا کھاتے ہوں گے اور الاؤ میں خاموشی سے جلتے رہتے ہوں گے' جیسے میں جلی ہوں۔ وہ اللہ والی باجی نہیں' شیطان ہے جس کے آستانے پر کارندے جال پھیلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ جانے کتنی ہی معصوم عورتیں ان کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ یہ تیرا بیٹا.... جس پر تو بڑا اتراتا ہے' شاید تیرے کمزور عقیدے کی سزا ہے.... لیکن.... لیکن میرا کیا قصور تھا' بتا' میرا کیا قصور تھا کہ میں لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ بول میرا کیا قصور تھا؟"

نوراں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ عارف کو لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ رہا ہو۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا پھر وہ کچھ کہے بغیر' نوراں کے قدموں میں ڈھے گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ سچ سننے کی ضد نہ کر۔ یہ سچ اتنا کڑوا ہے کہ تیری رگوں میں زہر اتار دے گا۔"

وہ پاگلوں کی طرح زنجیر کو جھٹکا دیتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ سلیم اور فیروزہ اس کی آواز سن کر کمرے میں آ گئے تھے۔ سلیم دوڑ کر عارف کے قریب پہنچا۔

"کیا ہوا ابا جی؟" اس نے اسے چھوا تو اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

اس رات سلیم کے گھر سے دو جنازے ایک ساتھ اٹھے۔ اپنے شفیق ابا جی کے اچانک مرنے کا اسے جتنا صدمہ تھا' اس سے زیادہ حیرت اسے پاگل ماں کے مرنے پر تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اتنے برسوں بعد اس کی ماں نے آخر ایسا کیا کہہ دیا تھا جسے سن کر ابا جی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ وہ کس سے پوچھتا.... کہ برسوں تک یہ راز اپنے اندر دفن رکھنے والی ماں بھی اس کے ساتھ ہی چل بسی تھی۔

○☆○

محبت میں کوئی موسم نہیں

اس کا ہم سفر اسے حجلۂ عروسی تک چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ گھر کے مکین بھی نہ جانے کہاں تھے۔ کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دونوں نندیں جو رخصتی کے وقت گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اتنا چہک رہی تھیں' اب نہ جانے کہاں تھیں۔

شادی کا گھر اور اتنا سناٹا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ رخصت ہو کر آج ہی آئی ہے۔ نہ کوئی رسم نہ کوئی آؤ بھگت۔

وہ سرخ رنگ کے بھاری شرارے سوٹ میں لمبا گھونگٹ نکالے بیٹھی کڑھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر تناؤ آ گیا تھا۔ دل اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کمرے کے باہر بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ سر جھکائے جھکائے گردن اکڑ سی گئی تھی۔

اماں نے رخصتی کے وقت بڑی نصیحتیں کی تھیں "بیٹا' ہر آزمائش سے گزر جانا اور سمجھوتا کرنا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ کچھ بھی تھا' اماں کے سر سے ایک بوجھ تو کم ہو گیا تھا۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا' شارق دوسری شادی پر راضی نہیں تھے مگر ان کی ماں زینت بیگم کا اصرار تھا۔ زبردستی کی شادی تھی۔ شارق کی پہلی بیوی سجیلہ کے انتقال کو ابھی صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ شارق کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

ابھی تو اس کی چہیتی بیوی سجیلہ کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ زینت بیگم نے بچے کا واسطہ دے کر بڑی مشکل سے اسے اس شادی پر راضی کیا تھا۔ زینت بیگم کا بڑھاپا تھا۔ وہ بچے کی دیکھ بھال کر نہیں سکتی تھیں۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ذمے داریوں میں مصروف تھیں۔ نوکروں پر وہ بھروسا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا' اس طرح بچے کو ماں مل جائے گی اور شارق کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔

وہ ان کی طرف سے بڑی فکر مند تھیں۔ شارق زیادہ وقت سجیلہ کی قبر پر گزار رہے تھے۔ زینت بیگم' بیٹے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان تھیں۔ یوں تو خاندان میں بھی کئی لڑکیاں تھیں۔ وہ ذرا بھی اشارہ کرتیں تو شارق کے لیے لڑکی مل جاتی مگر وہ چاہتی تھیں' ایسی لڑکی ہو جو بچے کو ماں کا پیار دے سکے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئی تھیں۔ وقار حسن کی بیٹی انیلہ میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں' وہ زمانہ شناس تھیں۔ ایک نظر میں لڑکی کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ انیلہ جیسی سمجھ دار لڑکی ہی شارق کی خوشیاں اور امنگیں واپس لاسکتی ہے۔

وقار حسن کی اوپر تلے پانچ بیٹیاں تھیں۔ کسی ایک کا بھی رشتہ طے ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ وقار حسن کا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ گورنمنٹ ملازمت تھی۔ بس سفید پوشی کا بھرم قائم تھا' عزت کے ساتھ گزر بسر ہورہی تھی۔ انیلہ سب سے بڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو انیلہ کی فکر بہت زیادہ تھی۔ ایسے میں شارق کا رشتہ خدا کی طرف سے ایک غیبی مدد تھی۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ برائی تو صرف ایک تھی کہ شارق شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا۔

ماں نے بڑی مشکل سے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ہامی بھری تھی۔ انیلہ سے تو کسی نے پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ انیلہ ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لینے والی لڑکی تھی۔ خواب دیکھنے کی عمر سے آگے نکل چکی تھی۔ اب تو بات صرف اماں ابا کا بوجھ ہلکا کرنے کی تھی۔ نہ تو مہندی آئی تھی' نہ گئی تھی۔ بڑی سادگی سے برات آئی۔ وقار حسن نے اپنی طرف سے سبھی مہمانوں کو مدعو کیا تھا۔ پہلی بیٹی کی شادی تھی۔ رشتے دار' دوست احباب سبھی کو بلایا تھا۔

وہ بیٹھے بیٹھے سوچتے ہوئے تھک سی گئی تھی کہ باہر اچانک قدموں کی آہٹ اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسرے لمحے وہ سب کی سب کمرے میں آگئیں۔ دونوں نندیں تھیں' ثریا اور آسیہ جو خیر سے شادی شدہ تھیں۔

"انیلہ بھابی' ان سے ملیے یہ شارق بھائی کے دوست عادل کی وائف ہیں' تمکین۔"

انیلہ نے آہستہ سے پلکوں کی جھالر اوپر اٹھائی۔ تمکین مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ایک سرخ مخملی ڈبیا سے انگوٹھی نکال کر اس کی نازک سی انگلی میں ڈال دی پھر کہا "ثریا آپا' دیکھیں' عادل کدھر ہیں۔ کافی رات ہوگئی ہے' گھر بھی جانا ہے۔"

"وہ شارق بھائی کے ساتھ باہر گئے ہیں' آتے ہی ہوں گے۔" دوسری بہن آسیہ نے کہا تو ثریا بولیں۔

"نہیں' یہ کوئی وقت ہے' کہیں جانے کا۔ میرے خیال میں سب اوپر بڑے ہال میں ہیں۔ شارق کے دوست بھی وہیں ہیں۔" ثریا نے اطلاع دی۔

"بھئی ماشاء اللہ۔ گھر بھی تو آپ کا اتنا بڑا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون کدھر ہے۔" تمکین نے ہنستے ہوئے کہا تو ثریا بولیں۔

"چند لوگ ہیں اتنے بڑے گھر میں۔ ایک دو دن میں ہم دونوں بہنیں بھی اپنے گھر چلی جائیں گی۔ یہ مالک ہیں' گھر سنبھالیں گی۔ اماں کا کیا ہے' انہیں تو بس دو وقت کی روٹی چاہیے۔"

"اچھا' میں تو چلتی ہوں۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔ دلہن بھی بے چاری بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے۔ میں

ابھی شارق بھائی کو بھیجتی ہوں۔" تمکین معنی خیز انداز میں کہتی ہوئی ثریا کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا تھا۔ اس کے اندر بھی سناٹا پھیلتا جارہا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ وہ چونک گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی' لمحے بھاگے جارہے تھے۔

یہ ارمانوں' امنگوں بھری رات کیسی وحشت زدہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے اندر اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس نے گھبرا کر گھونگٹ ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کا جہیز بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ زینت بیگم کے ہزار انکار کے باوجود باپ نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اسے جہیز دیا تھا۔ برسوں سے تنکا تنکا جوڑ کر اس کے لیے رکھا تھا۔ اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر نظر آگیا۔ یہ اسے اس کی کزن فوزیہ نے گفٹ کیا تھا۔

کمرے کا سناٹا اسے بہت کھل رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر آن کردیا اور خود تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

گھبرا کے نظر بھی ہار گئی
تقدیر کو بھی نیند آنے لگی
آواز تو دو کھوئے ہو کہاں
اب رات گزرنے والی ہے
اب رات .....

اس نے ٹرپ کر ٹیپ ریکارڈر آف کردیا۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی تھی مگر دوسرے لمحے باہر سے بھاری قدموں کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی' وہ اور جھک کر بیٹھ گئی۔ شاید انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو تھیں۔ دل کی دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی تھی' تب ہی ایک بھاری گمبھیر سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"معذرت چاہتا ہوں' آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ رونمائی میں اس کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا' اپنی عزیز ترین چیز آپ کے سپرد کررہا ہوں۔" شارق نے گھونگٹ الٹے بغیر ہی تین ماہ کے فہد کو اس کی گود میں ڈال دیا "آپ کے لیے اس گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اماں آپ کو بڑی چاہ سے بیاہ کر لائی ہیں۔ ان کا مان رکھیے گا اور میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔" اتنا کہہ کر وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئے۔

اس کے اندر بہت زور کا چھناکا ہوا۔ وہ ستم گر اتنا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے آنسو اس کے جھلمل کرتے سرخ دوپٹے میں جذب ہونے لگے۔ اس نے ایک نظر بچے پر ڈالی' خوب صورت گول مٹول سا بچہ اس کی گود میں بے خبر سو رہا تھا' جس کی ماں اسے دنیا میں لاتے ہی مرگئی تھی۔ اس کا دل اس معصوم کی بدنصیبی پر تڑپ اٹھا۔ وہ تو ویسے بھی بہت حساس طبیعت کی مالک تھی۔ اپنا دکھ بھول کر اس نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ اس انوکھی رونمائی نے اس کے لبوں پر چپ کی مہر لگادی۔ اس کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک ایک کرکے بھاری زیور اتارنے لگی۔

بچے کو لٹا کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی۔ اتنا بناؤ سنگھار کس کے لیے تھا۔ اس نے تو ایک نظر اسے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایک بار پھر آنسو تیزی سے رواں ہوگئے۔ سامنے کی ٹیبل پر وہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ستمگر تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک کھڑی اس کی تصویر کو دیکھتی رہی پھر عروسی لباس تبدیل کر کے وہ واش روم کی طرف چلی گئی۔ بہت دیر تک منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھنٹے مارتی رہی۔ واش روم سے نکل کر وہ بیڈ کے قریب آئی تو بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بھی آہستہ سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ پلکوں کے کنارے پھر بھیگنے لگے تھے۔

وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا مہندی سے رچا ہاتھ فہد کے سینے پر رکھا تھا۔ فہد اس کے پہلو میں بے خبر سو رہا تھا۔ شارق بہت دیر سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ صبح سویرے ہی اس کے کمرے میں آ گئے تھے۔ اب تو صبح کا اجالا اچھا خاصا پھیل چکا تھا مگر گھر کے سبھی لوگ تھکے ہوئے تھے۔ بے خبر سو رہے تھے۔

وہ خود رات بھر نہ سو سکے تھے۔ اپنے اسٹڈی روم میں جاگتے رہے تھے۔ سجیلہ کی یادوں نے انہیں ایک پل چین لینے نہیں دیا تھا اور آج تو ان کی بے قراری کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سجیلہ کی جگہ نئی عورت آ گئی تھی' سجیلہ کی یادوں کو دھندلانے کے لیے.... مگر نہیں' وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ وہ سوچتے ہوئے آہستہ سے صوفے پر دراز ہو گئے۔ اپنے ارادے کی خبر گھر والوں سے چھپانا چاہتے تھے اسی لیے یہی سوچ کر وہ اس کے کمرے میں آ گئے تھے۔

لائٹر سے سگریٹ جلا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے شارق کو بیٹھا دیکھ کر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ انہوں نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی' ٹیبل پر سے میگزین اٹھا کر پڑھنے لگے۔

گھر میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ دونوں نندوں کے بولنے کی آوازیں اس کے کمرے تک آ رہی تھیں۔ تب ہی بوا شکورن ناشتے کی ٹرے لیے اس کے کمرے میں آ گئیں۔ ان کے ساتھ اس کی نندیں ثریا اور آسیہ بھی تھیں۔

"او' آئی سی! تو فہد میاں کا تعارف آپ سے کرا دیا شارق بھائی نے؟" آسیہ نے سوتے ہوئے فہد کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"آپا' بھائی صاحب کدھر ہیں؟" شارق نے پوچھا۔

"ارے' تمہیں تو پتا ہے شارق' ان کی صبح دوپہر ایک بجے ہوتی ہے اور رات تو دیر سے سوئے ہیں' اللہ جانے کب اٹھتے ہیں۔ چلو' تم دونوں ناشتا کر لو۔ دلہن کی بہنیں بھی آنے والی ہوں گی انہیں لینے۔" وہ اٹھ کر واش روم کی طرف چلی گئی۔

"آسیہ! دلہن کی بہنیں آ گئی ہیں۔" بوا شکورن نے آ کر اطلاع دی۔

"ارے تو انہیں ادھر ہی لے آؤ۔" انیلہ واش روم سے آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس کی بہنیں اور کزن فوزیہ چہکتی ہوئی اس کے کمرے میں آ گئیں "سوری انیلہ! ہمیں دیر ہو گئی۔ یہاں تو ناشتا لگ چکا ہے مگر بھئی' ناشتا تو انیلہ کے لیے خالہ جان نے بنا کر بھیجا ہے۔"

"کیوں' کیا انہیں یہاں ناشتا نہیں ملے گا؟" شارق نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ثریا آپا فوراً بولیں "ارے' یہ رسم ہے۔"

"عجیب بے تکی رسم ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائے۔

"بھئی' ناشتا اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ کیا پتا' آپ ہماری بہن کو ناشتا ہی نہ دیں۔" صائمہ نے مذاق میں کہا تو شارق کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہو گیا' فوراً ہی بولے۔

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اتنی دور سے ناشتا تیار کر کے لائی ہیں۔"

"چلیے اب تو لے آئے نا۔"

"میرے خیال میں ناشتے پر بہت لمبی گفتگو ہو گئی' ناشتا بے چارا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ شارق بھائی' رحم کریں اس پر۔" فوزیہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا تو انیلہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آسیہ نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔

کوپکو کے بھاری' کامدار شلوار سوٹ میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کی تھی مگر شادی کا روپ اس پر خوب چڑھا تھا۔ وہ کافی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ کوئی بھی اس کے اندر کا حال نہ جان سکا تھا۔ کتنے خواب ٹوٹے تھے' ایک رات میں۔

"کیسے لگے شارق بھائی؟" فوزیہ کرید رہی تھی۔ وہ صرف ہولے سے مسکرا کر رہ گئی اور پھر وہ فہد کا سامان' دودھ کا ڈبا وغیرہ بیگ میں رکھنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" شارق نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔ بہنیں اٹھ کر دوسرے کمرے میں اس کی ساس سے ملنے چلی گئی تھیں۔ اس وقت وہ دونوں اکیلے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"فہد میرے ساتھ جائے گا۔"

"نہیں' وہ ثریا آپا کے پاس رہے گا۔ آپ اسے لے کر نہ جائیں۔"

"ثریا آپا کے پاس کیوں رہے گا؟ میرے ساتھ جائے گا۔ آخر یہ میری رونمائی ہے۔" اس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ شارق نظریں چرا کر رہ گئے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ڈرائیور آپ لوگوں کو گھر تک چھوڑ آئے گا۔" شارق کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے "آسیہ' شوفر سے کہو گاڑی نکالے۔"

زینت بیگم بھی اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی تھیں "کیوں بیٹا' تم نہیں جا رہے؟" انہوں نے شارق کو ٹوکا۔

"نہیں اماں! شام کو جاؤں گا۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ انیلہ کمرے سے باہر آئی تو اس نے جھک کر زینت بیگم کو سلام کیا۔

"جیتی رہو' آباد رہو۔" زینت بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ثریا فہد کو لیے کھڑی تھی' اس نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیے۔

"رہنے دو انیلہ! آج تو یہ ہمارے ہی پاس رہے گا' تم جاؤ۔"

"نہیں آپا' جو کام کل کرنا ہے' وہ آج ہی سے کیوں نہ شروع کیا جائے۔" اس نے ہولے سے مسکراتے ہوئے فہد کو اپنی گود میں لے لیا۔ تینوں بہنیں انیلہ کی اس حرکت پر تلملا کر رہ گئی تھیں۔ گاڑی جیسے ہی گیٹ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سے آگے بڑھی' فوزیہ نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا حماقت کی تم نے۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ خالہ' ممانی' تائی جان۔ سبھی تو موجود ہیں اور تم اسے لے کر جا رہی ہو۔ سب لوگ باتیں بنائیں گے کہ پہلے ہی دن بچہ ساتھ بھیج دیا۔"

"تو کیا ہوا' پتا تو ہے سب کو پھر ان لوگوں نے کون سا بھیجا ہے' میں خود لائی ہوں۔" اس نے ہولے سے جواب دیا۔

"ہاں' یہ تو ہمیں پتا ہے کہ یہ حرکت تمہاری تھی۔"

"اور کیا آپی' فوزیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" صائمہ نے کہا تو وہ بولی۔

"فضول بحث مت کرو۔" وہ سب کی سب ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"واقعی' تم سے بحث کرنا فضول ہے۔" فوزیہ نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا' گھر آگیا تھا۔

وہ ان لوگوں کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئی تو سب سے پہلے ماں کی نظر اس پر پڑی۔ آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک نظر بچے پر ڈالی' بولیں کچھ نہیں۔ سب ہی نے بچے کو اس کی گود میں دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر وہ خاموشی سے مسکراتی رہی۔

○☆○

وقت دبے پاؤں گزرنے لگا۔ اس کی ساری توجہ فہد کی طرف تھی۔ جیسے جیسے فہد بڑا ہو رہا تھا' اس کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وقت کچھ اور آگے سرک گیا تھا۔ فہد نے گھٹنوں کے بل چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی رہتی' کہیں گر نہ جائے۔ کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ زینت بیگم اسے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتیں۔ نصیب سے بچے کو پیار کرنے والی ماں مل گئی تھی۔ شارق کا رویہ اس کے ساتھ بے حد سرد تھا۔ بے حد روکھا لہجہ' رسمی سی بات چیت ہوتی تھی' ان کے درمیان۔

وہ آفس سے آکر اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو جاتے تھے جو اس کے کمرے کے برابر ہی میں تھا۔ سجیلہ شادی ہو کر اسی کمرے میں آئی تھی۔ اس کمرے سے شارق کی یادیں وابستہ تھیں۔ سجیلہ ان کی پسند تھی۔ زینت بیگم نے بھی کوئی مین میخ نہیں نکالی تھی۔ سجیلہ تھی بھی خاصی خوش شکل' گھرانا بھی ان کا ہم پلہ تھا۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

شارق نے ماسٹر کرنے کے بعد کاروبار سنبھال لیا تھا۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ماں باپ دونوں کی طرف سے ان کے حصے میں خاصی جائداد آئی تھی۔ انہوں نے رقم کو مناسب کاروبار میں لگایا ہوا تھا۔ سجیلہ کو پا کر وہ بہت خوش تھے مگر سجیلہ ان کی زندگی میں ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ فہد کی پیدائش کے چند گھنٹے بعد وہ ابدی نیند سو گئی۔ کیس بگڑ گیا اور لیڈی ڈاکٹر بچے ہی کی جان بچا سکی تھی۔

اب سجیلہ کی یادیں تھیں اور وہ تھے۔ زینت بیگم نے ان کی یہ حالت دیکھتے ہوئے تین مہینے کے اندر ہی ان کی شادی کر دی تھی اور انیلہ کی ماں کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

شارق کی والدہ کا خیال تھا کہ شادی ہو جائے گی تو وہ دھیرے دھیرے خوشیوں کی طرف لوٹ آئیں گے مگر وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ شادی کے بعد شارق نے انیلہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔

انیلہ کے میکے سے کوئی آجاتا یا انیلہ ان کے ساتھ میکے جاتی تو شارق کا روپ ہی بدلا ہوا ہوتا تھا۔ وہ سب کے سامنے اور اس کے گھر والوں کے ساتھ اتنی شائستگی سے پیش آتے تھے کہ ماں تو بیٹی کے نصیب پر رشک کرتی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنے طوفان اپنے اندر چھپائے بیٹھی ہے۔ وہ سب کے سامنے مطمئن نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ وقت اور حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا فیصلہ اس نے شادی کی پہلی رات ہی کر لیا تھا۔

فہد رات میں اکثر روتا تھا۔ وہ جاگ جاگ کر اسے سلاتی رہتی تھی۔ اس کے ماتھے پر کبھی بھی بل نہیں آئے تھے۔ وہ تو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے وہ اس کی سگی ماں ہو۔ وقت کب کسی کے لیے رکا ہے۔ اس کا کام چلنا ہے سو وقت کا پہیہ تیزی سے چل رہا تھا۔

○☆○

کتنے موسم آکر بیت گئے تھے۔ شارق کے رویے میں ذرا بھی لچک نہیں آئی تھی۔ فہد اب بولنے لگا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ اسے مما کہتا تو وہ کھل اٹھتی اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ معصوم فہد اس کی تنہائیوں کا ساتھی تھا۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا مگر اس کے لیے تو تمام موسم خزاں کے موسم تھے۔ وہ بہت دیر سے دریچے میں کھڑی ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں دیکھ رہی تھی۔ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑی۔ دیکھا سامنے شارق دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے کھڑے تھے۔

"آپ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں' کیا یہاں میں نہیں آسکتا۔" وہ نظریں چرا گئی۔

"کیوں نہیں۔"

کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموش کھڑی خوب صورت کارپٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اب نہ جانے کیا کہنے آئے ہیں' کیا چاہتے ہیں؟ وہ سوچ رہی تھی۔

"آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ کل فہد کی پہلی برتھ ڈے ہے اور سجیلہ کی برسی بھی۔" اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا تو انیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' بولی کچھ نہیں۔

پھر کچھ سوچ کر خود ہی کہنے لگی "شارق' کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دکھ اور سکھ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہمیں انہیں فیس کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اسی کا نام زندگی ہے۔"

اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں اپنی بات ختم کی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے "کل میں نے اپنے کچھ دوستوں اور ان کی فیملی کو انوائٹ کیا ہے۔ تمام انتظامات آپ کے ذمے ہیں۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنی بات کہہ کر تیزی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔

وہ ہلتے پردے کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ ویسا ہی اجنبی اجنبی سا تھا۔ وہ تو سمجھی تھی' وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے دل میں جگہ بنا لے گی مگر وہ تو وہیں کی وہیں کھڑی تھی' جہاں سے چلی تھی۔ اسی مقام پر تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس نے تو کہیں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

مالی کے ساتھ ہاتھ بٹاتے ہوئے کتنے نئے پودے لان میں اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے جن پر اب اس موسمِ بہار میں پھول کھلنا شروع ہو گئے تھے۔

آج وہ صبح ہی سے تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ شارق صبح نو بجے چلے گئے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ کہاں گئے ہیں۔ اس نے سوچا گھر تو فون کر دے کہ آج شام فہد کی برتھ ڈے ہے۔ یہی سوچ کر اس نے نمبر ڈائل کیے۔ فون صائمہ نے اٹھایا تھا۔ اس نے فہد کی برتھ ڈے کا بتایا تو صائمہ جلدی سے بولی۔

"آپی! شارق بھائی کل شام آئے تھے' کہہ کر گئے تھے۔"

وہ ایک دم سلگ کر رہ گئی۔ مجھے بتایا تک نہیں کہ..... پھر وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ صائمہ' جلدی آنا تم لوگ' او کے!" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

بوا کے ساتھ مل کر اس نے سجیلہ کی نیاز کے لیے کھانا بنوایا تھا۔ وہ واش روم سے آئی تو بوا تمام کھانوں کی ڈشز فاتحہ کے لیے رکھ چکی تھیں۔ اگر دان میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ انیلہ جانماز پر بیٹھی فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ سفید دوپٹا ماتھے تک ڈھکا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ تبھی شارق ہاتھوں میں کئی پیکٹ لیے کمرے میں داخل ہوئے تو بری طرح چونک گئے۔

سادگی میں بھی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔ وہ فاتحہ سے فارغ ہوئی تو بوا سے کہا۔

"یہ تمام کھانا خیرو کے ہاتھ مسجد بھیج دیں۔"

"اس سے پہلے کہ مہمان آنا شروع ہو جائیں' آپ تیار ہو جائیں فٹافٹ!" انہوں نے دونوں پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "پیکٹ میں ساڑی ہے اسی کو پہن لیجئے گا۔" ان کے لہجے میں ایک حکم تھا۔ اپنائیت یا محبت کی چاشنی سے خالی سپاٹ لہجہ۔ وہ اتنا کہہ کر کمرے سے جا چکے تھے۔

"اونہہ! اپنے دوستوں عزیزوں کے سامنے اپنی جھوٹی محبت کا ڈراما کب تک کھیلتے رہو گے' شارق احمد!" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

فہد کو تیار کر کے وہ خود بھی تیار ہو گئی تھی۔ آج وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ مہمان بھی آ گئے تھے۔ مہمانوں کو بٹھانے کے لیے لان میں انتظام کیا گیا تھا۔ تھوڑے سے مہمان تھے' چھوٹا سا فنکشن تھا۔

وہ فہد کا ہاتھ تھامے برآمدہ عبور کرتے ہوئے ادھر ہی آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شارق کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اسے دیکھ کر ہونٹ کاٹ لیے۔ وہ جو اس کے لیے سرخ کامدار ساڑی آج ہی لائے تھے' وہ اس نے نہیں پہنی تھی' اس کے بجائے وہ بلیک اینڈ وائٹ شلوار سوٹ میں تھی۔ بلیک شرٹ پر وائٹ موتیوں کا کام بنا ہوا تھا۔ وہ بہت سوبر سی لگ رہی تھی۔ سب ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔ لمبے سلکی بالوں کو اس نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ وہ فہد کو لیے شارق کے قریب آئی تو انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ ساڑی آپ نے....."

"یہی ٹھیک ہے۔" اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ اس پر ایک نظر ڈال کر رہ

گئے۔

سب کی تالیوں کی گونج میں فہد نے سالگرہ کا کیک کاٹا۔ آج وہ بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ رات گئے فنکشن اختتام کو پہنچا۔ مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ فہد کو بھی نیند آ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اسے لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ چند منٹ ہی میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

وہ ابھی کپڑے تبدیل کرنے کے خیال سے اٹھی ہی تھی کہ شارق آ گئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور اس کے قریب آ گئے۔

تھری پیس سوٹ میں آج وہ بھی خوب جچ رہے تھے۔ پرفیوم کی مسحور کن خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔

"آپ نے وہ ساڑی آج کیوں نہیں پہنی؟ میں آج کے دن کے لیے خاص طور پر لایا تھا۔ آپ نے تو پیکٹ کھولنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔" انہوں نے پیکٹ سامنے پڑا دیکھ لیا تھا۔ جواب بھی پیک تھا "میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا اور صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" انہوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا اور اس کے قریب آ کر اسے بازو سے تھامتے ہوئے اپنے قریب کر لیا۔ وہ تڑپ کر ان سے دور ہٹ گئی۔

"آخر آپ عورت کو کیا سمجھتے ہیں؟ کھلونا..... جب چاہا کھیل لیا' جب چاہا پھینک دیا۔" اس کے لہجے میں بڑی کڑواہٹ تھی "کیا آپ ان لمحوں کو لوٹا سکتے ہیں شارق' جن کے تصور میں ڈوبی ہوئی میں یہاں۔ اس کمرے میں تنہا بیٹھی آپ کا انتظار کرتی رہتی تھی۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے بے اختیار رو دی۔

"تم جو کہو گی انیلہ! آج میں سب سننے کے لیے تیار ہوں مگر سزا تجویز کرنے سے پہلے مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا ایک موقع تو دو....."

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی' پلیز۔ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

"نہیں انیلہ! آج میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔ مختصر الفاظ میں تم سے کچھ کہنا چاہوں گا۔ پلیز' میری بات سن لو....."

"جب میں صرف دو سال کا تھا' پاپا نے اماں کو طلاق دے دی اور اپنی مرضی سے دوسری شادی کر کے جرمنی چلے گئے۔ ثریا آپا مجھ سے دو سال بڑی تھیں اور آسیہ صرف ایک سال کی تھی۔ اماں پر ایک اور ظلم کیا گیا اور پاپا خاموشی سے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے اور دونوں لڑکیوں کو ماں کے پاس چھوڑ دیا۔ میری سوتیلی ماں نے مجھ پر اتنے ظلم کیے کہ آج بھی خیال آ جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اماں کو یہاں تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ پاپا نے کافی بینک بیلنس اماں کے نام چھوڑا تھا۔ بہنوں کا الگ حصہ اکاؤنٹ میں تھا۔ پاپا کا کوئی معمولی کاروبار نہیں تھا۔ پاپا نے کاروبار کرتے کرتے خاصی ترقی کر لی تھی۔ کچھ پاپا پر قسمت مہربان ہوتی چلی گئی۔

"میں آٹھ سال کا ہو گیا تھا' چھ سال سے جرمنی میں پاپا کے ساتھ تھا۔ روزانہ ہی پاپا کے ساتھ میری سوتیلی ماں جھگڑا کرتی تھی۔ آخر پاپا نے اسی میں عافیت سمجھی کہ مجھے پاکستان بھیج دیا جائے۔ پاپا خود پاکستان آ کر مجھ میری ماں کے پاس چھوڑ گئے۔ میری ماں کی دعائیں رنگ لائی تھیں اور میں واپس آ گیا تھا۔ وقت گزر گیا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھا۔ میری زندگی میں سجیلہ آگئی مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔

"میں نے دوسری شادی کبھی نہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بچہ بھی میری طرح سوتیلی ماں کے ظلم کا نشانہ بنے مگر اماں کی ضد نے میری ایک نہ سنی اور تم میری زندگی میں آگئیں۔ میں بچے کو تم سے وہی تحفظ دلانا چاہتا تھا جو ایک ماں دیتی ہے' چنانچہ شادی کی رات فہد کو تمہاری گود میں ڈال دیا تھا' رونمائی کہہ کر۔ مجھے پتا تھا' عورت اپنی رونمائی کو کتنی چاہ سے رکھتی ہے۔ میں نے ایک نفسیاتی طریقہ استعمال کیا تھا۔ گو کہ یہ خود غرضی تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کتنا حوصلہ رکھتی ہو' کہاں تک سمجھوتا کرسکتی ہو۔ فہد کو کتنا پیار دے سکتی ہو۔

"تم نے میری زیادتیوں کے باوجود ہمیشہ فہد کو عزیز رکھا اور یہی تمہاری جیت ہے اور تم میرے دل میں ایک نرم گوشہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ہار تو میری ہوئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ سجیلہ کی یادوں کے سہارے تمام زندگی گزار دوں گا مگر تمہارے ایثار نے' تمہاری قربانیوں نے سجیلہ کی یادوں کو دھندلا دیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ فہد کی برتھ ڈے کے ساتھ ساتھ سجیلہ....." جملہ ادھورا ادھورا چھوڑ کر انہوں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

انہوں نے سامنے رکھا ہوا دوسرا پیکٹ کھولا جس میں سونے کے جڑاؤ سیٹ کا ڈبا تھا۔ انہوں نے ہار نکال کر اس کے گلے کی طرف بڑھایا "آج میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں' یہ رونمائی ہے تمہاری۔"

"رونمائی ایک بار ہی دی جاتی ہے شارق صاحب! اور وہ آپ دے چکے ہیں۔" اس نے فہد کی طرف اشارہ کیا جو بے خبر سو رہا تھا۔

انیلہ کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر دھنک کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ شارق نے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

اس کے دل کے در و بام پر بہاروں کی یہ پہلی دستک تھی۔

○☆○

وفا کے موڑ پر

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی گلی میں مڑ گئی تھی اس کے کانوں سے گنگناہٹ ٹکرائی۔

ہر راہ پہ کترائے' ہر موڑ پہ گھبرائے
منہ پھیر لیا تم نے ہم جب بھی نظر آئے

اس نے مڑ کر دیکھا' سجو گنگناتا ہوا اس کے پیچھے آرہا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور ہوگئی۔ اس نے غصے اور نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ ارومہ نے کتابوں کا بیگ شانوں سے اتار کے ٹیبل پر رکھا اور کولر سے پانی لے کر پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

"اماں! کیا آج برف والا نہیں آیا؟" اتنی شدید گرمی اوپر سے کھولتا ہوا پانی۔"

"کتنی بار منع کیا ہے ارومہ کہ آتے ہی اتنا پانی نہ پیا کر' ایک تو صبح ناشتے میں کچھ نہیں کھاتی ہے' خالی ایک کپ چائے انڈیل کر چلی جاتی ہے اور اب خالی پیٹ پانی انڈیل لیا۔" ماں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی "یہ تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟"

وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی بولی کچھ نہیں۔

"کیا آج پھر....؟" ماں نے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ارومہ کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں اماں میں آخری بار کہہ رہی ہوں' آپ سجو کی ماں سے بات کریں ورنہ کسی دن گلی میں سب کے سامنے سجو کو اتنا ذلیل کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔" ارومہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

"نہیں ارومہ بیٹی! اس قسم کے بچھورے لڑکوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے' خوا مخواہ بات بڑھ جائے گی۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ تلملاتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی۔

"اچھا اب غصہ نہ کر' میں بات کرلوں گی اس کی ماں سے۔ چلو تم چل کر کھانا کھالو۔"

"کیا پکایا ہے؟"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"دال چاول۔" ماں نے بتایا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر دسترخوان پر آگئی۔

ارومہ کا تعلق ایک لوئر کلاس گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ فیروز حسن سپر مارکیٹ میں ایک کپڑے کی بڑی دکان پر بیٹھتا تھا جہاں سے اسے صرف ڈھائی ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اس مہنگائی کے دور میں ڈھائی ہزار میں گزر بسر کرنا دشوار ہی ہوتا تھا' اوپر تلے تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ثمرینہ اور سومہ کی شادی جلد ہی کردی تھی۔ ارومہ تیسرے نمبر پر تھی۔ ارومہ نے ابھی میٹرک کے بعد کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ فیروز حسن کی تینوں بیٹیاں شکل صورت کی کافی اچھی تھیں۔ ثمرینہ اور سومہ کی شادی بھی اسی لیے جلدی ہوگئی تھی۔ فیروز حسن نے کسی طرح دونوں کو عزت کے ساتھ رخصت کردیا تھا مگر ارومہ دونوں بہنوں سے زیادہ حسین تھی' نقش بھی بڑے تیکھے تھے' سنہرے لانبے بال' شربتی آنکھیں' سرخ سفید رنگت' گلاب کی پنکھڑی جیسے خوب صورت ہونٹ' سومہ کے سسرالی رشتے داروں میں سے اس کے کئی رشتے آچکے تھے مگر فیروز حسن کے نہ حالات اس قابل تھے کہ وہ فوری طور پر کچھ فیصلہ کرتا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ارومہ پڑھائی سے فارغ ہولے تب تک حالات بھی کچھ درست ہوجائیں گے۔ ابھی تو ثمرینہ اور سومہ کی شادی پر لیا ہوا قرض اتارنا تھا۔ یوں بھی دونوں ماں باپ جانتے تھے ارومہ کے خواب اونچے ہیں' وہ پڑھ لکھ کر کچھ بننا چاہتی تھی۔ اسے پڑھ لکھ کر صرف ہانڈی چولہا کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔ وہ مرد کے شانہ بشانہ چلنے کی خواہش مند تھی۔ تعلیم کے میدان میں وہ ہمیشہ کامیاب رہی تھی' ہمیشہ اس نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ فیروز حسن کو بھی اس پر بڑا فخر تھا۔

سجو' ارومہ کے محلے ہی کا لڑکا تھا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ سجو کا گھرانا بھی تعلیم یافتہ تھا۔ سجو سے دو بڑی بہنیں شکیلہ اور جمیلہ بی ایڈ کرکے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ سجو کا باپ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا جو ریٹائرڈ ہونے کے چند سال بعد چل بسا۔ سجو کی اوچھی حرکتوں سے بہت نالاں رہتا تھا۔ سجو کی حرکتوں کی وجہ سے محلے کے سبھی لوگ ان لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ سجو کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی بات سننے میں آتی رہتی تھی۔ سارا دن آوارہ گردی کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے بمشکل میٹرک کیا تھا۔ کچھ لوگوں کا تو خیال تھا کہ اس نے امتحانات میں زبردست نقل کی تھی' جبھی اچھے خاصے نمبرز حاصل کرلیے تھے ورنہ تو وہ اسکول جاتا بھی کم ہی نظر آتا تھا مگر اب چند مہینوں سے سجو' ارومہ کے تعاقب میں رہنے لگا تھا۔ کبھی کالج کے گیٹ پر مل جاتا اور کبھی جلتی دوپہر میں آتے ہوئے گلی کے نکڑ پر مڈبھیڑ ہوجاتی۔ ارومہ کو دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی فلمی گانا گنگنانے لگتا۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ اس کی ان اوچھی حرکتوں سے ارومہ عاجز آگئی تھی۔

"لفنگا پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اللہ میاں نے شکل کیا اچھی بنادی ہے خود کو گلفام سمجھنے لگا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔" ارومہ کمرے میں بیٹھی سوچے جارہی تھی۔ دوسرے لمحے احمر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اس کی دوست شگو کا بھائی احمر' کتنی تیزی سے اس کے دل میں آبسا تھا۔

اس دن وہ شگو کے گھر پہنچی تو شام ڈھل رہی تھی۔ شگو کا تعلق ہائی سوسائٹی سے تھا۔ وہ گیٹ پر پہنچی تھی کہ گاڑی کے ہارن کی آواز پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا' وہائٹ گاڑی میں وجیہہ نوجوان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں گیٹ کھل گیا۔ سامنے شگو کھڑی تھی۔

"ارے تم؟" شگو نے اسے یوں اچانک دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہورہی تھی۔ وہ سائیڈ میں ہوگئی۔ وہ گاڑی لاک کرکے اس کی طرف گھوما۔

"بھائی جان.....!"

"یہ ارومہ ہیں۔" احمر نے شگو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھا ارومہ' بھائی جان کیسا پہچانے کہ تم ارومہ ہی ہوسکتی ہو۔" ارومہ مسکرا کر رہ گئی۔

وہ بولا "جی بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر کل سے سو بار شگو آپ کا ذکر کرچکی ہے اس کا تو کھانا ہضم نہیں ہوتا آپ کا ذکر کیے بغیر۔"

"اب یقین آیا تمہیں میں تمہارا ذکر کتنا کرتی ہوں۔" شگو کہتی ہوئی اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "ارومہ.....! بھائی جان کل شام امریکا سے آئے ہیں' انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تین سال سے وہیں تھے۔ پاپا کا بزنس بھی امریکا میں ہے۔ پاپا تو ہر سال آتے جاتے رہتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں امی سے ملاؤں۔ شکر ہے آج امی گھر پر ہیں۔ وہ بھی بھائی جان کی وجہ سے ورنہ تو امی کو اپنی سوشل ورکنگ سے فرصت نہیں ملتی۔" شگو اپنی امی کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"امی دیکھیے کون آیا ہے؟"

"میرا خیال ہے یہ ارومہ بیٹی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا ارومہ! امی کو تمہارا نام بھی یاد ہے جبکہ تم آج پہلی بار آئی ہو۔"

وہ بولیں "ارومہ بیٹی' غائبانہ تعارف شگو نے اس قدر تفصیل سے کرایا ہوا ہے کہ میں نے تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیا۔" انہوں نے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ وہ بھی ہولے سے مسکراتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ کتنا خلوص تھا ان کے لہجے میں۔ غرور یا تکبر تو نام کو نہیں تھا۔ لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ وہ چند لمحوں میں ان کی گرویدہ ہوگئی۔

"شگو! تمہاری' امی تو بہت پر خلوص ہیں۔" اس نے کہہ ہی دیا۔

"تو جنابہ! امی کس کی ہیں۔ میری ہی طرح ہوں گی۔" شگو نے فخریہ کہا تو وہ ایک دم ہنستی چلی گئی۔

پھر بولی "آنٹی! میں اس لیے آئی تھی کہ کل ظہر کے بعد قرآن خوانی ہے آپ لوگ ضرور آئیے گا۔" اسی وقت احمر کمرے میں داخل ہوئے۔

"یہ کسے دعوت دی جارہی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کم از کم آپ کو نہیں بلایا جارہا ہے مجھے اور امی کو جانا ہے۔" شگو نے شرارت سے احمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے کون سا شوق ہے تمہارے ساتھ جانے کا۔ ویسے بھی کل میرا دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے۔" احمر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ نے تو دل پر لے لیا۔ آپ بھی آجایئے گا۔" ارومہ نے اس کی سحر انگیز شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے بے تکلفی سے کہا اور جانے کے لیے اٹھ گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"آیئے میں آپ کو ڈراپ کردوں۔" احمر نے فوراً پیشکش کی۔

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔"

"ارے ارومہ، چلی جاؤ نا احمر بھائی ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔"

"شگو! تمہیں پتا ہے ابو آگئے ہوں گے اور انہیں یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میں اس طرح کسی کے ساتھ آؤں، بہت ناراض ہوں گے وہ مجھے کسی اجنبی کے ساتھ دیکھ کر۔"

"سن لیا شگو کہ گویا ہم غیر ہیں، اجنبی ہیں۔" احمر نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو شگو مسکرا کر رہ گئی۔

"کوئی بات نہیں احمر بھائی! ابتدا میں ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔" اس نے ذو معنی جملہ کہا تو ارومہ اسے گھور کر رہ گئی مگر وہ اپنی بات کہہ سننے لگی اور بولی "تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" وہ یہ کہتی ہوئی ارومہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ارومہ نے اب انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ احمر بار بار سامنے لگے شیشے میں سے اسی کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار بہت سلو تھی۔ شگو نے احمر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"احمر بھائی جان! لگتا ہے گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا ہے جبھی رینگ رہی ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ احمر مسکرا دیے بولے کچھ نہیں۔ اچانک گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی گلی کے نکڑ پر اسے اتار کر احمر نے گاڑی واپسی کے لیے موڑلی۔ ارومہ جیسے ہی گلی میں مڑی سجو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اس کو دیکھتے ہی گنگنایا۔

عرض ہے یہ گلہ نہیں
سمجھا ہے جتنا آپ نے اتنا تو میں برا نہیں

ارومہ نے مڑ کر نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم بڑھاتی گھر کے اندر چلی گئی۔

○☆○

سجو کی ماں اس کی روز روز کی شکایتوں سے تنگ آگئی تھی "اے اللہ اس سے تو بہتر تھا جہاں تو نے پانچ بیٹیاں دی تھیں ایک اور سجو کی جگہ دے دیتا۔ یہ روز روز کی ذلت اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"اماں بس کریں، ہر وقت سجو کو برا بھلا کہتی رہتی ہیں۔" سجو کی سب سے بڑی بہن شکیلہ نے ماں کو ٹوکا۔

"اے تو کون سا سکھ دیا ہے تمہارے اس اکلوتے بھائی نے۔ ہر جگہ ذلیل کرا دیا ہے، سارا دن آوارہ گردی کے علاوہ کوئی کام ہے اسے، نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ بہنوں کا، تمہیں کچھ پتا ہے کل ارومہ کی ماں آئی تھی شکایت لے کر کہ ارومہ کا پیچھا لیا ہوا ہے اس سجو نے۔ آتے جاتے اسے تنگ کرتا ہے۔ اے اللہ! ایسی اولاد کو......"

"اماں چپ ہو جائیں۔" شکیلہ نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "اماں آپ غصے میں بولتے ہوئے کچھ نہیں سوچتیں کہ کیا کہہ رہی ہیں۔"

اسی وقت سجو گھر میں داخل ہوا "آپا بڑی زور کی بھوک لگی ہے کیا پکا ہے، فٹافٹ کھانا نکالیں۔"

ماں نے اسے گھورا "ہاں شام ڈھلے اب آیا ہے کماؤ پوت، جلدی سے نواب زادے کے لیے دسترخوان لگاؤ۔ ارے تجھے اپنی عزت کا خیال نہیں ہے تو کچھ میری عزت کا خیال رکھ لے۔ اب تو محلے کی لڑکیوں کے

پیچھے بھی پڑنے لگا ہے۔ کچھ تو خوف کر، تیری بھی ایک نہیں پانچ بہنیں ہیں، یہ بھی باہر نکلتی ہیں اگر کوئی ان کے ساتھ ایسی حرکت کرے، کبھی سوچا ہے؟"

"اماں بس، بہت لیکچر سن لیا چپ ہو جائیں، چین سے کھانا کھانے دیں۔" سجو نے جھنجلا کر کہا۔

"ارے تجھے تو چین ہی چین ہے، راتوں کی نیندیں تو، تو نے میری اڑا دی ہیں، دن کا سکون غارت ہو گیا ہے، بڑا ارمان تھا تمہارے ابا کو ایک تو بیٹا ہو جو پڑھ لکھ کر کوئی مقام حاصل کرے جب تو تین بہنوں پر پیدا ہوا تو کیسی خوشیاں منائی گئی تھیں پر تو نے تو ماں باپ کا نام ڈبو دیا۔ ہماری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے تیری وجہ سے کوئی اس گھر میں آنا پسند نہیں کرتا۔ تجھے تو آوارہ گردی سے فرصت نہیں ہے میٹرک کر کے بھی ڈبو دیا۔ باپ کے بعد شکیلہ اور جمیلہ نے باہر قدم نہ نکالا ہوتا تو اس گھر میں فاقے ہوتے۔ تجھ سے تو اچھی جمیلہ ہے کہ بی کام کر کے بینک میں لگ گئی ہے۔ شکیلہ کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی ہے، تیرے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ تجھے کچھ ہوش ہے یہ گھر کا کرایہ، سارے خرچے کس مشکل سے پورے ہوتے ہیں۔ رملہ، انیلہ، زرینہ کی پڑھائی کے اخراجات الگ۔ ارے میں سوچتی ہوئی کچھ بچے تو ان دونوں بڑی کو تو کسی طرح پار لگاؤں پر تجھے کہاں خیال ہے، تجھے تو اپنی اوچھی حرکتوں سے فرصت نہیں ہے۔ پانچ بہنیں سر پر بیٹھی ہیں اور تجھے کوئی پروا نہیں ہے کوشش کرے تو کہیں کلرک ہی لگ جائے گا مگر جب بیٹھے بیٹھے اچھا کھانے اور پہننے کو مل جائے تو......"

"اماں! بس بہت ہو چکا، جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تم کوئی نہ کوئی بہانا نکال کر شروع ہو جاتی ہو۔ اسی لیے میں گھر میں نہیں بیٹھتا۔"

"ہاں تو سڑک پر منگا لیا کر کھانا بھی۔" ماں نے جل کر کہا۔

سجو نے پانی کا خالی گلاس رکھتے ہوئے شکیلہ کی طرف دیکھا اور بولا "آپا! اماں کو سمجھا دو میں ارومہ سے شادی کروں گا۔ میرا رشتہ لے کر جانا ہے انہیں ارومہ کے گھر۔" سجو نے کہا تو ماں نے اسے جل کر دیکھا۔

"ہوش میں رہ کر بات کیا کر، ایسی چپل ماروں گی کہ دماغ ٹھکانے آجائیں گے۔ مجنوں کا چیلا، شادی کرے گا ارومہ سے، نکھٹو کو کون اپنی بیٹی دے گا۔ تو ہے اس چاند سی صورت والی لڑکی کے قابل، ارے کسی قابل ہوتا تو میں خود اسے لے کر آتی مگر تجھے تو آوارہ گردی سے فرصت نہیں ہے۔ اپنے لچھن دیکھے ہیں، ارومہ کیا میں کسی بھی لڑکی کی ذمے داری نہیں لے سکتی۔ سن لیا تو نے۔ آئندہ میں ارومہ کا نام نہ سنوں۔" ماں نے اسے اچھی طرح لتاڑا۔

سجو کچھ نہ بولا چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"اماں! آپ ہر وقت سجو کو نہ ڈانٹا کریں اب وہ بچہ نہیں ہے۔" منجھلی بہن جمیلہ نے کہا تھا۔ ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ارے تم لوگوں کا ہاتھ ہے اسے بگاڑنے میں۔ بیٹھے بیٹھے سارے اس کے شوق پورے ہو جاتے ہیں، اسے کیا ضرورت ہے ہاتھ پیر ہلانے کی، بس ہر وقت بلے بدلنے کو دے دو۔" ماں کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا تھا۔

جمیلہ خاموشی سے وہاں سے سرک گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس دن اروما کالج پہنچی تو معلوم ہوا کہ شگو نہیں آئی ہے۔ شگو سے دوستی ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا مگر دونوں کی دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ ایک دن ملاقات نہ ہوتی تو دونوں بے چین ہو جاتیں۔ کلاس میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ چھٹی کے بعد وہ شگو کے گھر جائے گی۔ اسے فکر ہو چلی تھی شگو چھٹی بہت ہی کم کرتی تھی۔ کالج سے چھٹی کے بعد جیسے ہی وہ کالج کے گیٹ پر پہنچی گیٹ پر سجو کو دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ اسے نظرانداز کرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی تب ہی اس کی گنگناہٹ کی آواز اس کے بہت قریب سے کانوں سے ٹکرائی۔

ہر راہ پہ کترائے، ہر موڑ پہ گھبرائے
منہ پھیر لیا تم نے، ہم جب بھی نظر آئے

اروما کے قدم ایک رک گئے، پلٹ کر دیکھا وہ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے، دل فریب مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے میں بڑی تیزی سے اروما کا ہاتھ اٹھا اور سجو کے منہ پر بھرپور تھپڑ پڑا۔ وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہ تھا، ایک دم بوکھلا گیا۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کالج کے دوسرے لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔

"لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ بہت شوق ہے فلمی گانے سنانے کا۔ آج ہم تمہیں ایسا سنگیت سنائیں گے کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔" یہ کہتے ہوئے لڑکوں نے اس کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ گھونسے، لاتیں اس پر پڑنے لگیں۔

"آج مزہ آئے گا لوفر کہیں کا، بہت تنگ کرتا ہے کم بخت۔" اروما دوسری لڑکیوں کے ساتھ بڑبڑاتی بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ اس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ اب وہ شگو کے گھر بھی نہیں گئی سیدھی گھر پہنچی تو شگو کو اپنا منتظر پایا۔

"ارے شگو تم۔ چلو اچھا ہوا میں تمہارے گھر نہیں گئی۔ اچھا یہ تو بتاؤ آج کالج کیوں نہیں آئیں؟"

"بات یہ ہے کہ کل رات ہم لوگ شادی سے کافی تاخیر سے گھر پہنچے کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، سوچا چھٹی مار جاؤں مگر دیکھو صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔"

"شکریہ، نوازش۔" اروما نے جھک کر کہا۔

اروما کی ماں بھی ادھر آ گئی تھی "چلو تم دونوں کھانا کھالو میں نے دسترخوان لگا دیا ہے۔"

"امی! کیا پکایا ہے؟"

"کچے قیمے کے کباب بنائے ہیں، تمہارے ابا بہت دنوں سے کہہ رہے تھے۔ میں نے سوچا آج بنا ہی ڈالوں۔"

"سچ امی! کچے قیمے کے کباب تو شگو کو بھی بہت پسند ہیں۔" اس نے شگو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں آنٹی! کباب کا نام سن کر تو بھوک عروج پر پہنچ گئی ہے۔" شگو نے بے تکلفی سے کہا۔

"چلو تو پھر باتیں نہ بناؤ، فٹافٹ ٹوٹ پڑو اور ویسے بھی آج میں بہت خوش ہوں۔" اروما نے دوسرے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

شگو بولی "کیوں کیا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا، بات ہی اتنی زبردست ہے کہ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کباب کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی "ٹھیک طرح سے لو، تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے بات تو پوری بتاؤ ہوا کیا تھا؟" شگو نے پھر پوچھا۔

"پہلے اطمینان سے کھانا کھالو پھر تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"کھانا تو میں کھا رہی ہوں اگر ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" شگو نے کہتے ہوئے اروما کی ماں کی طرف دیکھا جو کچن سے نکل کر ادھر ہی آ رہی تھیں۔

"آنٹی! آپ بھی آیئے نا۔"

وہ سلاد کی پلیٹ اروما کو پکڑا کر بولیں "تم لوگ کھاؤ، میں بھی آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی دوبارہ کچن کی طرف چلی گئی۔

"ارے ہاں، آج وہ تمہارا چھچھورا عاشق نظر نہیں آیا سچ گلی بڑی سونی سونی لگ رہی تھی۔" شگو نے مسکراتے ہوئے اروما کو چھیڑا۔

"آج میں نے اس کا حساب چکا دیا۔" یہ کہتے ہوئے اروما نے پوری بات شگو کو بتا دی۔

"اروما! تم نے یہ اچھا نہیں کیا، اب پتا نہیں کہ اس کا ردِعمل کیا ہو، کہیں بات نہ بڑھ جائے۔ لڑکوں نے پتا نہیں کتنی ٹھکائی کر ڈالی ہوگی، بے چارہ سجو....."

"اچھا بڑی ہمدردی ہے تمہیں اس لفنگے سے۔" اروما نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مگر اروما یہ اچھا نہیں ہوا۔"

"کیا اچھا نہیں ہوا؟ کس کی ٹھکائی ہو گئی؟" اروما کی ماں نے کمرے میں آتے ہوئے کچھ بات ان کی سنتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں! کل رات شگو نے فلم دیکھی تھی۔ اس کی اسٹوری سنا رہی تھی۔" اروما نے بات بناتے ہوئے مسکرا کر شگو کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں پھر اسی دوسرے کمرے میں آ گئی جہاں پہلے بیٹھی تھیں۔

"ویسے جو کچھ تم نے کیا وہ ٹھیک نہیں ہوا۔" شگو نے دوبارہ بات شروع کی۔

"خدا کے واسطے شگو، کوئی اور بات کرو، مجھے بور مت کرو۔ ویسے بھی آج میں بہت خوش ہوں۔"

"ویسے اروما، ایک بات ہے سجو اچھا خاصا کڑیل نوجوان ہے شخصیت تو بری نہیں ہے بس ذرا حرکتیں اوچھی ہیں۔" شگو نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اب تم باز آ جاؤ اگر اتنا ہی اچھا لگتا ہے تو بات کروں تمہارے لیے؟" اروما نے تپ کر کہا۔

"افسوس تو یہی ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" شگو نے کہا اور ہنستی چلی گئی۔

"باز آ جاؤ فضول بکواس کرتی رہتی ہے۔" اور خود بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد شگو چلی گئی تو اروما پلنگ پر لیٹ گئی اس نے ابھی رسالہ تھاما تھا کہ ماں گھبرائی ہوئی آئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ارے ارومہ تم نے کچھ سنا؟"

"کیا اماں؟" اس نے رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج سجو کو لڑکوں نے بہت مارا ہے سر میں پانچ ٹانکے آئے ہیں' ہاتھ پیروں میں بھی کافی چوٹ آئی ہے۔"

"ارے چھوڑیں اماں' ہمیں کیا جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے مگر اماں آپ کو یہ سب کس نے بتایا کہ لڑکوں نے مارا ہے؟"

"ارے وہی نصیبن خالہ' ابھی کھڑے کھڑے بتا کر گئی ہیں۔"

"اماں! یہ نصیبن خالہ بھی خوب ہیں' پورے محلے کی خبر رکھتی ہیں لگتا ہے انہیں اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ جب دیکھو ادھر ادھر جھانکتی پھرتی ہیں۔" ارومہ نے بڑبڑاتے ہوئے رسالہ دوبارہ اٹھالیا۔

"اچھا ذرا دروازہ بند کرلو' میں سجو کے گھر ہو آؤں۔" اماں نے کہا تو وہ بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔"

"نہیں ارومہ' کچھ بھی ہو محلے داری تو نبھانی پڑتی ہے۔ اب اگر سجو کے کرتوت ایسے ہیں تو گھر والوں سے تو منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ اچھے خاصے شریف خاندانی لوگ ہیں' اس کی ماں بڑی محبت سے ملتی ہے۔ خیر خیریت معلوم کرلینے میں کیا حرج ہے بیٹا۔"

"اماں آپ کو جانا ہے تو جائیں مگر میرے سامنے اس خبیث کا نام نہ لیا کریں۔" ارومہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ اماں خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر چلی گئی۔

○☆○

تپتی دوپہر میں وہ بس اسٹاپ پر کھڑی اپنی بس کا انتظار کررہی تھی شگو ڈرائیور کے ساتھ جاچکی تھی۔ اس کی بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تبھی اچانک احمر کی گاڑی اس کے قریب آکر رک گئی۔ وہ ایک دم چونک گئی۔

"اب حیران نہ ہوں' بیٹھ جائیے' میں ڈراپ کردوں گا۔" احمر نے شائستگی سے کہا۔ وہ خاموش کھڑی رہی بولی کچھ نہیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟ گرمی بہت ہے' دھوپ کی تپش سے آپ کا رنگ کالا ہوجائے گا۔" احمر نے شوخ سے لہجے میں کہا تو وہ ہولے سے مسکرائی اور بولی۔

"آپ کو اتنی فکر کیوں ہے؟"

"بھئی فکر تو کرنی پڑتی ہے' اسی فکر میں تو ادھر آنکلا کہ آپ بس اسٹاپ پر کھڑی دھوپ میں تپ رہی ہوں گی۔ چلیے اب جلدی آجائیے لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسٹاپ پر کھڑے کئی لوگ ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی فوراً پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی اس نے ایک گہرا سکون کا سانس لیا۔ ائر کنڈیشن گاڑی میں بیٹھ کر وہ کھو سی گئی "واہ اللہ میاں جی لوگ ائر کنڈیشن گاڑی لیے پھرتے ہیں' ایک ہم ہیں جو ٹین کی چھت تلے گرمی کی شدت برداشت کرتے ہوئے زندگی

گزار رہے ہیں۔" آنکھیں بند کیے سوچے جارہی تھی پھر اچانک بولی "احمر صاحب اس وقت ادھر کیسے آگئے؟"

"یہ صاحب لگانا ضروری ہے۔ صرف احمر بھی کہہ سکتی ہیں۔" احمر نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ وہ زیرِلب مسکرائی اور بولی "تو سنئے صرف احمر صاحب۔" اس نے اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"شگو نے آپ کے بارے میں ٹھیک۔۔ہی کہا تھا۔" احمر نے پرشوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تھا اس نے؟ بتائیں نا پلیز۔" اس نے ایک ادا سے پوچھا۔

"یہی کہ آپ مذاق اڑانے میں ماہر ہیں۔"

وہ خجل سی ہوگئی "سوری احمر صاحب آپ نے تو مائنڈ کیا۔ ویسے بھی اصولی بات ہے مجھے زیادہ بے تکلف ہونا اچھا نہیں لگتا۔ کہیں کہیں تکلف برقرار رکھنا لازم ہوتا ہے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو احمر اسے دیکھ کر رہ گئے بولے کچھ نہیں۔

"آپ کی گاڑی رینگ رہی ہے' مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔ اماں پریشان ہورہی ہوں گی۔"

"سمجھئے! ابھی بس نہیں آئی ہے۔ آپ اسٹاپ پر کھڑی ہیں۔" احمر نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہ کیسے سمجھ لوں' بس تو آکر گزر بھی گئی ہوگی' پلیز گاڑی کی رفتار بڑھائیے۔" اس نے عاجزی سے کہا تو احمر نے کچھ سوچتے ہوئے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ رفتار اتنی زیادہ تھی کہ اسے چکر سے آنے لگے۔

"پلیز احمر صاحب کیا کررہے ہیں؟" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زبردست جھٹکے سے گاڑی اچھلی اس کا چہرہ احمر کے شانے سے آکر ٹکراگیا۔ ایک کرنٹ سا دوڑ گیا پورے جسم میں۔ وہ جھینپ کر جلدی سے سنبھل کر سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ احمر کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"کیا آپ نارمل انداز میں گاڑی نہیں چلاسکتے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" اس اچانک سوال پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ہونقوں کی طرح پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔ کچھ دیر تو وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" احمر نے دوبارہ جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ہاں' ویسے تو طبیعت بالکل ٹھیک ہے مگر جب سے آپ کو دیکھا ہے دل کا عجیب عالم ہے۔"

"پھر تو آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ احمر نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میری جان پر بنی ہے اور آپ بات مذاق میں اڑا رہی ہیں۔" احمر کا لہجہ خاصا سنجیدہ تھا۔

"احمر صاحب! یہ مغرب نہیں' مشرق ہے' یہاں فیصلے والدین کرتے ہیں۔ ہم مشرق کی لڑکیاں تو ویسے بھی بے اختیار ہوتی ہیں' جن کے سارے حقوق شادی سے پہلے والدین کے پاس ہوتے ہیں اور شادی کے بعد تمام اختیارات شوہر کے نام منتقل ہوجاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں بڑی کڑواہٹ تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"آپ تو اچھی خاصی تقریر کرلیتی ہیں۔" احمر نے مسکراتے ہوئے کہا مگر وہ ایک دم سنجیدہ تھی۔

"احمر صاحب! آپ جو چاہتے ہیں وہ ناممکن سی بات ہے بھلا' کبھی زمین آسمان بھی ایک ہوئے ہیں۔"

"ناممکن کو ممکن بنانا میرا کام ہے' مجھے تو صرف آپ کی ہاں چاہیے باقی کام میرا۔" احمر نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے' جب حقیقت شگو اور آنٹی کو پتا چلے گی تو....."

"وہ فوراً راضی ہوجائیں گی۔" احمر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"خوش فہمی بہت زیادہ ہے آپ کو۔"

"مایوسی کفر ہے۔" احمر نے بے ساختہ کہا "آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ شگو کی بھی یہی خواہش ہے اور امی کا تو خیال ہے کہ یہ چاند کا ٹکڑا تو ان کے ہی گھر میں آنا چاہیے۔" احمر کا لہجہ بے اختیار شوخ ہوگیا تھا۔

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" ارومہ نے جھینپتے ہوئے کہا اور بولی "مگر احمر صاحب۔"

"پھر وہی صاحب۔" احمر نے ٹوکا تو وہ ایک دم ہنستی چلی گئی۔

گھر آگیا تھا وہ جلدی سے گاڑی سے اتری اور اپنی گلی میں مڑ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ سجو کہیں نظر نہیں آرہا تھا پھر اسے ایک دم یاد آیا سجو تو ان دنوں بستر پر پڑا ہے۔ وہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکرائی چلو کچھ دن تو سکون سے گزر جائیں گے۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوئی اماں صحن میں الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھیں۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آگئی۔

وہ حسین سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی "احمر تمہیں کیا خبر تمہاری پر اثر شخصیت نے تو مجھے پہلے ہی دن اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔"

اس دن وہ کالج سے نکلی تو بہت خوش تھی آج صبح شگو نے اس سے احمر کے سلسلے میں بات کی تھی۔ ارومہ مسکراتی رہی تھی بولی کچھ نہیں اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا یہ سب حقیقت ہے۔ کیا خوابوں کی تعبیریں اتنی جلدی پوری ہوجائیں گی۔ وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔ کیا واقعی اسے سب کچھ اپنی خواہش کے مطابق مل جائے گا اس کی خواہشوں کی تکمیل کا لمحہ آگیا تھا وہ انہی حسین سوچوں میں گم گلی کے نکڑ پر پہنچی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ سامنے سجو کھڑا تھا۔ بہت کمزور سا چہرہ مرجھایا ہوا لگ رہا تھا اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔

وہ ایک لمحے کو اسے دیکھتی رہ گئی۔ کتنی اداسیاں تھیں اس کی آنکھوں میں۔ آج نہ اس کے ہونٹوں پر کوئی فلمی گیت تھا وہ تو بس اسے ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ خاموش نگاہوں سے۔ وہ کچھ سوچ کر رکی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کے اندر چلی گئی۔ سجو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا سجو روزانہ ہی ہمیشہ کی طرح گلی کے نکڑ پر کھڑا مل جاتا مگر بالکل خاموش' جیسے گونگا ہو' نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی نہ گیت۔

وہ اسے اس روپ میں دیکھ کر طنزیہ مسکراتی' بے نیازی آگے بڑھ جاتی چلو ایک طمانچے نے یہ کام تو دکھایا کہ سارے گیت بھلا دیے۔

اس دن شگو کالج آئی تو اسے سرسری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"کل شام میں امی کو لے کر آرہی ہوں۔" شگو نے شوخ سے لہجے میں کہا "کیا کریں بھائی جان نے بہت پریشان کیا ہوا ہے' رات کو تارے گنتے رہتے ہیں' تمہارے فراق میں' کون سا جادو کیا ہے تم نے ذرا مجھے تو بتادو؟" شگو نے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی وہ اس کے انداز پر دل کھول کر ہنستی رہی لیکن پھر کچھ سوچ کر خود ہی خاموش ہوگئی۔

اسے خاموش دیکھ کر شگو بولی "اگلے مہینے احمر بھائی واپس امریکا جارہے ہیں۔ انجینئرنگ کے اعلیٰ عہدے پر جاب مل گئی ہے۔ ویسے بھی پاپا کا بزنس شروع سے وہیں ہے۔ امی کو تو اپنے سوشل ورک سے اتنا لگاؤ ہے کہ وہ پاپا کے پاس ایک بار بھی امریکا نہیں گئیں' پاپا خود ہی سال چھ مہینے میں چکر لگا لیتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے کہ امی نے یہاں کافی کام کیا ہے خواتین کے حقوق کے لیے امی کافی پاپولر ہوگئی ہیں مگر ارومہ ایک بات ہے' امی نے اپنے شوق کی خاطر کبھی اولاد سے غفلت نہیں برتی۔ ہر طرح ہم بہن بھائی کا خیال رکھا۔ اب یہی دیکھ لو جب سے بھائی جان آئے ہیں امی بہت کم تقریبات میں شرکت کررہی ہیں' زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتی ہیں نوکر چاکر ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ سے احمر بھائی کے لیے ان کی پسند کی ڈشیں تیار کرتی رہتی ہیں۔"

"ہاں شگو امی ہیں بہت گریٹ میں بھی ان کی فین ہوگئی ہوں۔" ارومہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو شگو بولی۔

"اور امی اب اپنی فین کو بہو بنانے کے لیے آرہی ہیں۔ امی کا بس چلے تو وہ ایک ہفتے کے اندر تمہیں رخصت کرا کر لے جائیں مگر ارومہ' احمر بھائی چاہتے ہیں کہ جب دو سال بعد واپس آئیں گے تو تمہیں رخصت کرا کے امریکا لے جائیں گے۔"

ارومہ خاموشی سے شگو کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہوں من میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں اور محترمہ اداکاری یوں کررہی ہیں جیسے انہیں کوئی پروا ہی نہیں۔" شگو نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

○☆○

"دیکھو ارومہ کی اماں میں مانتا ہوں لڑکا بہت اعلیٰ خاندان سے ہے' شریف ہے وہ لوگ بھی بہت اچھے اور مخلص ہیں مگر ہم سے بہت اونچے ہیں' ایسا نہ ہو ساری زندگی ہماری ارومہ احساسِ کمتری کا شکار رہے۔ قدم قدم پر اسے کم حیثیت کا طعنہ سننے کو نہ ملے۔ ارومہ کی ماں رشتے ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرنا چاہیے۔ اونچی اڑان اچھی نہیں ہوتی۔ ثمرینہ نے جو رشتہ بتایا ہے' اس پر غور کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ احمر کے رشتے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو اور یہ رشتہ جوڑنا سراسر حماقت ہوگی۔ یہ لوگ صرف اپنی ارومہ کی حسین صورت سے متاثر ہوکر رشتہ مانگ رہے ہیں ورنہ تو....."

"تو اس میں برائی بھی کیا ہے' ہر کوئی کچھ نہ کچھ تو دیکھتا ہے' کوئی دولت دیکھتا ہے تو کوئی صورت' تم تو بلاوجہ برائیاں نکال رہے ہو۔ میرا تو خیال ہے جب انہیں کسی بات پر اعتراض نہیں ہے' ہماری جو پوزیشن ہے سامنے ہے کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں پھر بھی اگر وہ ارومہ کی خواہش مند ہیں تو یہ اللہ کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے اتنا اچھا رشتہ بھیجا ہے۔ ارومہ کے ابا! یہ غیبی مدد ہے اور جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں' ہماری

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تمہاری مداخلت کیا معنی رکھتی ہے۔" اروما کی ماں بولتی چلی گئیں۔ فیروز حسن خاموش رہے پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ٹھیک ہے اروما کی ماں جیسی تمہاری مرضی کرو اللہ بہتر کرے۔"

سجو کے گھر والے بہت حیران تھے وہ تو ایسا بدلا تھا کہ اندر باہر سبھی کو حیران کر دیا تھا۔ سجو صبح آٹھ بجے آفس چلا جاتا اور شام کو گھر آتا۔ اب وہ اروما کو بھی کئی کئی دن تک نظر نہیں آتا تھا۔

ان دنوں اروما اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ اس کے بابا فیروز حسن نے احمر کا رشتہ منظور کر لیا تھا۔

آج اروما کی منگنی کی رسم تھی۔ گھر کے باہر چھوٹا سا شامیانہ لگا کر مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ احمر کی ماں کا تو اصرار تھا کہ منگنی کی رسم کی تقریب ہال میں ہو مگر اروما کے بابا نے صاف انکار کر دیا تھا کہ نہیں وہ اپنی حیثیت کے مطابق ہی کام کریں گے اور منگنی کی رسم سادگی سے ادا کی جائے گی۔

احمر کی ماں نے زیادہ اصرار نہیں کیا کہ کہیں فیروز حسن رشتہ ہی دینے سے انکار نہ کر دیں۔

وقت بڑی سبک رفتاری سے پرواز کر رہا تھا۔ احمر منگنی کے بعد امریکا چلے گئے تھے اروما اور شگو کی ملاقاتیں کالج میں ہوتی رہتی تھیں۔ اب وہ دونوں کالج سے یونیورسٹی میں آگئی تھیں۔

ان دنوں سجو اروما کو بہت ہی کم نظر آتا تھا۔ سجو کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ اس کی ماں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ اللہ نے سجو کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی راہ دکھائی۔ سجو پانچ وقت کی نمازیں بڑی پابندی سے ادا کرنے لگا تھا۔

سجو کی پرانی اوچھی اور بچھوری حرکتوں کو سبھی فراموش کر چکے تھے۔ اب تو سجو نظر جھکا کر آتا جاتا تھا۔ سب ہی اس کے اس بدلتے روپ پر حیران تھے۔ سارا دن آوارہ گردی کرنے والا سجو اب کسی گلی یا نکڑ پر کھڑا نظر نہیں آتا تھا۔

سجو نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر کا ایگزام بھی دے دیا تھا اور بہت اچھی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ اس کی ماں نے محلے بھر میں اس کی کامیابی پر مٹھائی تقسیم کی۔

اکثر اروما بھی اسے دیکھ کر سوچنے لگتی کیا یہ وہی سجو ہے یہ تو بالکل ہی بدل گیا ہے بالکل سنجیدہ، سوبر سا انداز لیے ہوئے وہ نیچی نیچی نظروں سے اروما کو دیکھتا ضرور تھا۔

وقت کچھ اور آگے سرک گیا تھا۔

سجو نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ دونوں بڑی بہنوں شکیلہ اور جمیلہ کی شادی کر دی تھی۔ اب دوسری بہنوں کے اچھے رشتوں کی تلاش میں تھا۔ ان دنوں سجو کی ماں نے اس کے لیے بھی لڑکیاں دیکھنی شروع کر دی تھیں۔

ان دنوں سجو بہت اپ سیٹ سا رہنے لگا تھا۔ انیلہ سے اس نے سنا تھا "احمر، اروما کا منگیتر امریکا سے واپس آگیا ہے اور آج کل دونوں طرف تیزی سے شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی ہیں۔" وہ یہ سب کچھ سن کر پریشان ہو گیا تھا "اروما تم کیا جانو تمہارے ہجر میں، میں کتنا رویا ہوں۔ کتنا تڑپتا رہا ہوں مگر تمہاری نظر میں میرے یہ آنسو بے قیمت ہیں۔ تم کیا جانو میرے بے قرار دل کا حال تم تو مجھے لوفر، لفنگا ہی سمجھتی ہو۔ کاش تم نے کبھی میرے دل کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ہوتی۔" وہ بہت دیر سے کمرے میں اندھیرا کیے

سوچے جا رہا تھا آج وہ آفس سے بھی جلدی آگیا تھا۔

باہر گلی میں بہت زیادہ شور ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھا کہ دیکھے باہر کیا ہو رہا ہے کیسا شور ہے ابھی اس نے کمرے سے باہر قدم نکالا تھا کہ رملہ تیزی سے آتی ہوئی اس سے ٹکرائی۔ وہ سجو بھائی، سجو بھائی، اروما کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ اروما کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ اروما کھانا پکا رہی تھی۔" رملہ نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ سجو تیزی سے اروما کے گھر کی طرف دوڑا۔ چار پانچ مکان کے بعد اروما کا گھر تھا۔ سجو تیزی سے مجمع کو چیرتا ہوا اروما کے گھر کے اندر داخل ہوا۔ اروما کی ماں بری طرح چیخ رہی تھی "ہائے میری اروما ابھی تو کچن میں گئی تھی کہ زبردست دھماکا ہوا اور گیس کا سیلنڈر پھٹ گیا۔ ارے میری بچی کو بچالو۔"

آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اروما کے کپڑوں میں آگ لگ چکی تھی۔ اس کی چیخیں گھٹی گھٹی سی نکل رہی تھیں۔ سجو تیزی سے کچن کی طرف لپکا اور اروما کو گھسیٹ لیا۔ اروما ایک جھٹکے سے کچن سے باہر آگری۔ سجو نے آگ پر قابو پانے کے لیے گھر کے کئی لحاف اس پر ڈال دیے۔ اروما بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ بری طرح جھلس چکی تھی۔ سجو اروما کو لے کر اسپتال پہنچا۔ اروما کی ماں اور محلے کی نصیبن خالہ اس کے ساتھ تھیں۔ فیروز حسن کو اور اروما کی بہنوں کو حادثے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ سب اسپتال پہنچ گئے تھے۔ اروما زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا آئی سی یو روم میں تھی۔ سجو بے چینی سے ٹہل رہا تھا وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سب پریشان تھے اروما کی ماں کی بری حالت تھی۔ احمر کے گھر والے بھی پہنچ گئے تھے۔

"یہ سب کیسے ہو گیا؟" شگو نے اروما کی بڑی بہن ثمرینہ سے پوچھا۔

"بس شگو کیا بتائیں، ناگہانی آتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔" ثمرینہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"بیٹا! اللہ سے اچھی امید رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شگو کی ماں نے ثمرینہ کا شانہ تھپتھپایا "بہن آپ بھی حوصلہ رکھیں۔" انہوں نے اروما کی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ احمر خاموشی سے کھڑے تھے وہ کسی سے کچھ نہیں بولے تھے گم صم سے تھے۔

رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ احمر، شگو وغیرہ جا چکے تھے مگر سجو وہیں موجود تھا۔

"بیٹا! اب تم بھی گھر جاؤ۔ تمہاری ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔" فیروز حسن نے سجو سے کہا۔

"انکل! اماں کو پتا ہے میں کہاں ہوں۔ میں آپ لوگوں کو اس پریشانی میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" فیروز حسن خاموش ہو گئے بولے کچھ نہیں۔

کٹھن وقت گزر گیا تھا۔ اروما کی جان بچ گئی تھی۔ زخم گہرے تھے۔ اس کے چہرے کے الٹے گال پر ایک کافی بڑا زخم تھا، ہاتھ پیروں میں بھی خاصے زخم تھے۔ اروما کی ماں سے بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی

"نہ جانے کس کی نظر لگ گئی میری اروما کو۔" ماں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آنٹی پریشان نہ ہوں زخم بھر جائیں گے۔ سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے، ایک سے ایک دوا ایجاد ہو گئی ہے۔ جلے ہوئے زخم کا نشان بھی رہا تو دوا کے استعمال سے داغ صاف ہو جائیں گے۔" سجو نے اروما کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اروما نے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ کچھ نہ بولا خاموش ہو گیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سجو روزانہ ہی شام کو آفس سے سیدھا اسپتال چلا جاتا مگر ہمیشہ اروما اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی یا آنکھیں بند کر لیتی۔ جیسے کہ سو رہی ہے۔ اس حرکت پر سجو کا دل پارہ پارہ ہو جاتا اروما تم مجھ سے جتنی نفرت کرتی رہو مگر میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں' کرتا رہوں گا۔" وہ سوچتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تو سومہ نے اروما سے کہا۔

"اروما اگر اس دن سجو نہ ہوتا تو تیرا بچنا مشکل تھا۔ یہ تو خدا کی طرف سے غیبی مدد تھی کہ اس شام سجو گھر پر تھا ورنہ تو وہ پارٹ ٹائم ملازمت کرتا ہے۔ گیارہ بجے آتا ہے' وہ تو رملہ نے مجھے بتایا کہ سجو اس دن جلد گھر آگیا تھا۔ اروما' اسی نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر تمہیں شعلوں کے بیچ میں سے نکالا تھا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ جھلس گئے تھے۔ شاید تم نے دیکھا نہیں اس کے ہاتھوں پر بھی کئی زخم ہیں۔" سومہ بولتی رہی اروما خاموشی سے سن رہی تھی بولی کچھ نہیں۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"سومہ باجی! شگو کے گھر سے کوئی نہیں آیا؟"

"ہاں سب اسی دن آئے تھے۔ کل شگو نے فون کر کے خیریت معلوم کی تھی۔"

"اچھا۔" اروما ہونٹ کاٹ کر رہ گئی "احمر کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟ تم نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔ تبھی شگو کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیسی ہو؟ اروما؟" شگو نے پھولوں کا گلدستہ اس کے بستر پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اروما کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شگو بولی۔

"اروما! احمر بھائی کو پاپا کے بزنس کے سلسلے میں فوری طور پر امریکا جانا پڑ گیا۔ وہ بھی آتے مگر وقت نہیں ملا۔ اچانک روانگی ہو گئی۔" شگو نے رک رک کے لہجے میں کہا تو وہ سن سی ہو کر رہ گئی۔

احمر کیا میں اتنی غیر اہم تھی کہ تم ملے بغیر چلے گئے۔ شاید تم میں میری بدصورتی قبول کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہ گئی پلکوں کے کنارے نم ہو چلے تھے اس نے آنکھوں کو ہتھیلی سے رگڑ ڈالا۔ شگو کافی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہی مگر وہ چپ چاپ لیٹی اپنے کمرے کی سفید چھت کو تک رہی تھی۔

اروما پندرہ دن اسپتال میں رہ کر گھر آئی تو سارے زخم بھر چکے تھے مگر چہرے پر جو زخم گال پر تھا وہ ٹھیک تو ہو گیا تھا مگر اس جگہ کا گوشت سکڑ گیا تھا جس سے کافی حد تک چہرہ بدنما سا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی شکل آئینے میں دیکھتی تو رونے لگتی۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر بھی زخموں نے گہرے داغ چھوڑے تھے۔

سجو کا ان دنوں گھر میں آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ وہ روز ہی شام کو چلا آتا۔ اماں سے باتیں کرتا رہتا اور اکثر فیروز حسن سے بھی دیر تک باتیں ہوتی رہتیں۔ وہ دیکھتی اور کڑھتی رہتی۔

اس نے کئی بار اروما سے بھی مخاطب ہونا چاہا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے اس جگہ سے اٹھ جاتی جہاں وہ بیٹھا ہوتا۔

اس دن سجو کے جانے کے بعد اروما نے کہا "اماں' سجو کو منع کر دیں وہ یہاں نہ آیا کرے۔"

"نہ اروما' کسی کے خلوص کا جواب اس طرح نہیں دیا جاتا۔ بھلا میں کیسے منع کر دوں اگر اس دن سجو....."

"بس کریں اماں! میرے کان پک گئے ہیں ایک ہی بات سن سن کر۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ ماں اس کا بگڑتا موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

ان دنوں اروما کی ماں بہت پریشان تھی۔ جب سے اروما اسپتال سے آئی تھی احمر کے گھر سے اسے دیکھنے کوئی نہیں آیا تھا۔ شگو بھی نہیں آئی تھی۔ اندیشوں نے انہیں فکر مند کیا ہوا تھا۔

ادھر اروما کے دل کی بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی وہ سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ احمر تم تو مجھ سے ملے بغیر واپس چلے گئے' تم تو شادی کے لیے آئے تھے پھر واپس کیوں چلے گئے؟ شگو تم بھی نہ آئیں تم' سب کو کیا ہو گیا ہے تم کو تو میرے بغیر ایک پل چین نہیں آتا تھا کالج بند ہونے کے بعد ہم کیسے کیسے پروگرام بناتے تھے وہ خوب صورت دن کہاں چلے گئے' وہ لمحے کہاں گم ہو گئے؟

"دیکھ اروما کون آیا ہے؟" ماں کی آواز پر وہ اپنی نہ ختم ہونے والی سوچوں سے چونک گئی۔ سامنے اماں کے ساتھ شگو کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"کیسی ہو اروما؟" شگو نے قریب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آگیا تمہیں میرا خیال' بڑا مان تھا مجھے تمہاری دوستی پر مگر تم تو اول درجے کی....."

"پلیز اروما! آگے کچھ نہ کہنا مجھے خود احساس ہے مگر میں چاہتے ہوئے بھی نہ آسکی۔ آج بھی بڑی ہمت کی ہے' تم سے نظر ملانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔" شگو کا لہجہ ایک دم اداس سا ہو گیا تھا۔

اروما چونک گئی بولی کچھ نہیں۔ جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی ہو۔ کچھ دیر کمرے میں بالکل خاموشی چھائی رہی پھر اروما ہی بولی "شگو! تم میں کچھ کہنے کا حوصلہ ہو نہ مگر تم جو کہنے آئی ہو' وہ سننے کا حوصلہ مجھ میں ہے۔" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ شگو حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو شگو جو کہنا ہے کہہ دو؟" اروما نے آہستہ سے کہا۔ شگو نے اروما کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔

"اروما! مجھے بے انتہا دکھ کے ساتھ یہ بات بتانی پڑ رہی ہے کہ احمر بھائی نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اروما پہلے ہی دن ڈاکٹر نے احمر نے بتایا تھا کہ تمہارے چہرے کے کچھ زخم نمایاں رہ جائیں گے جیسا کہ یہ تمہارے گال کا داغ ہے۔" احمر بھائی نے اسی رات مجھ سے کہا تھا "شگو اروما کے ایک گال پر زخم بہت گہرا ہے جو ٹھیک تو ہو جائے گا مگر چہرے پر بدنما نشان چھوڑ جائے گا۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا مگر میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اور امی مل کر فیصلہ یوں کریں گے۔" شگو بولتی رہی وہ یوں ہی پرسکون بیٹھی رہی مگر اس کے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

احمر تمہارے سارے وعدے' سارے قسمیں سب فریب تھا تم تو زندگی کی پہلی آزمائش میں آؤٹ ہو گئے۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں یہ محبت نہیں محبت کی توہین ہے۔ تم کیا جانو احمر محبت کیا ہوتی ہے۔ محبت ہنساتی بھی ہے محبت رلاتی بھی ہے۔ جب محبت زخمی ہو جائے اس کی شدت اتنی ہی بڑھ جاتی ہے اور ناکام محبت کی کسک قطرہ قطرہ رلاتی ہے' سسکاتی ہے' تڑپاتی ہے اور شاید یہ محبت کی کسک مجھے ساری زندگی تڑپاتی رہے گی' رلاتی رہے گی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ارومہ! کچھ تو کہو' کچھ تو بولو میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔" شگو کی آواز پر وہ اپنی سوچوں سے چونک گئی۔

"کیا کہوں کہنے کو کچھ باقی نہیں بچا ہے یہی کہہ سکتی ہوں۔"

"نہیں ارومہ! تم کم از کم مجھ کو الزام نہیں دے سکتیں۔ میں نے احمر بھائی سے بہت جھگڑا کیا مگر وہ نہ مانے' مجھے دکھ ہے ان کے اس فیصلے پر۔

جو محبت آزمائش کی گھڑی کے وقت دامن بچالے اسے محبت نہیں خودغرضی کہا جاسکتا ہے ارومہ مجھے تم ہمیشہ عزیز رہوگی مگر کاش میں احمر بھائی اور امی کو سمجھا سکتی مگر امی نے تو ایک بار بھی احمر بھائی کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی وہ تو خود یہ فیصلہ کرتے وقت آگے آگے تھیں اگر امی کوشش کرتیں تو مجھے یقین تھا کہ احمر بھائی ان کی بات مان لیتے مگر....."

"چھوڑو شگو' اس قصے کو۔ ارومہ نے زخم سہنے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔" ارومہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"شگو اسے گلے لگا کر بہت دیر تک روتی رہی پھر جاتے وقت بولی۔

"ارومہ! آنٹی سے میں کچھ نہ کہہ سکوں گی تم خود ہی بتادینا۔"

شگو چلی گئی تو اماں کمرے میں آگئی۔

"خیریت تو ہے؟" اماں نے اس کے بجھے بجھے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی خلا میں گھورتی رہی پھر بولی۔

"اماں! احمر نے انکار کردیا ہے۔"

"کیا کہا تم نے احمر نے انکار کردیا شادی سے؟" اماں کا غم کی شدت سے برا حال تھا "کیسے دوغلے لوگ ہیں ارے تمام تیاری تقریباً مکمل ہے شادی کی اور اب....." اماں کا گلا رندھ گیا لہجے میں آنسوؤں کی نمی نمایاں تھی۔

"اماں! کیوں روتی ہیں' یہ قسمت کے کھیل ہیں۔" ارومہ نے آہستہ سے کہا۔

"ارے پگلی قسمت کو کیوں الزام دیتی ہے یہ لوگ تو تمہارے ابا کو پہلے ہی پسند نہیں تھے۔ یہ اونچی سوسائٹی کے لوگ' یہ دولت اور حسن کے پجاری ہوتے ہیں۔ ان دو میں سے ایک بھی مل جائے تو گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور اگر دونوں اکٹھا مل جائیں تو وارے نیارے ہوجاتے ہیں ان کے' یہ گھاٹے کا سودا کرتے ہی نہیں۔"

"اماں! سارے لوگ ہی خوب صورتی کے تمنائی ہوتے ہیں۔ باطن کی دلکشی کو کون دیکھتا ہے۔" ارومہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

اماں بولیں "ہاں تو میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں بیٹا کہ آج تمہارے چہرے پر یہ بدنما داغ رہ گیا ہے تو ان لوگوں نے کیسی نظریں پھیرلیں ہیں۔ ہم نے ہی پرکھنے میں غلطی کی ورنہ آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ زمانے کو تو ہنسنے کا بہانہ مل گیا نا۔ لوگ کتنی باتیں بنائیں گے۔"

"چھوڑیں اماں' کیوں اپنا دل جلا رہی ہیں۔" ارومہ نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ماں چپ چاپ اٹھ کر باہر صحن میں چلی گئی تو ارومہ کے رخساروں پر بہت سارے آنسو پھیلتے چلے گئے۔

○☆○

زندگی رواں دواں تھی وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے گردش کررہا تھا۔ وقت کے گزرتے مرہم نے کچھ کام دکھایا تھا۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ کبھی کبھی شگو اس سے ملنے آجاتی۔ شگو کو دیکھ کر اس کے زخم رسنے لگتے۔

ارومہ نے بی کام کرکے جاب کرلی تھی۔ شگو نے بھی اس کے ساتھ ہی بی کام کیا تھا مگر اسے جاب کی اجازت نہیں ملی۔ بہت جلد اس کی شادی ہونے والی تھی وہ مصروف ہوگئی تھی۔

ارومہ کی ماں اور باپ فیروز حسن ان دنوں بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ اب ارومہ عمر کی ان منزلوں پر تھی جہاں پہنچ کر والدین فکرمند ہوجاتے ہیں۔ اس کے چہرے کے بدنما داغ کی وجہ سے کوئی بھی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ سوچا کیا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ فیروز حسن کی حسین و جمیل ارومہ کو زندگی کے اس المیے سے بھی گزرنا ہوگا کہ وہ یوں قدم قدم پر ٹھکرائی جائے گی۔ اکثر آنے والے یہ کہتے پلٹ جاتے "کتنی پیاری لڑکی ہے مگر ایک داغ نے سارے حسن کو داغدار کردیا ہے۔" وہ ایسے جملے بارہا سنتی رہی تھی۔ آفس میں بھی اکثر اس کے بارے میں کھسر پھسر ہوتی رہتی تھی۔ اب وہ یہ سب سننے کی عادی ہوچکی تھی۔

دو دن سے ثمرینہ اور سومہ آئی ہوئی تھیں۔ دونوں کے بچوں نے مل کر وہ ہنگامہ کیا ہوا تھا کہ اللہ کی پناہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آج وہ آفس بھی نہیں گئی تھی صبح سے کمرے میں بند پڑی تھی۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی وہ باہر نہیں نکلی تھی شور ہنگامے سے اس کا سر پھٹا جارہا تھا۔

سومہ اس کے کمرے میں آکر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ارومہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم مستقل کمرے میں بند ہو' آج تم آفس بھی نہیں گئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ کچھ نہ بولی خاموش سی تھی گم صم سی۔

"دیکھ ارومہ یہ جو زندگی ہے نا یہ دکھ کا مجموعہ ہی تو ہے اور جو دکھ تم نے پال رکھا ہے اسے میں حماقت ہی کہوں گی اس بے وفا' ہرجائی کا کب تک سوگ مناتی رہوگی۔ کتنے سال دبے پاؤں گزر گئے ہیں اور گیا وقت کبھی واپس پلٹ کر نہیں آتا۔ یہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی ایک بڑی حماقت ہے۔ دیکھو ارومہ' عورت کی زندگی مرد کے سہارے کے بغیر ادھوری ہے۔ تم اس صفحے کو اپنے دل سے پھاڑ کیوں نہیں دیتیں جس پر اس بے وفا کا نام لکھا ہے۔ اس کا نام مٹا کیوں نہیں دیتیں۔"

"سومہ آپی! دل پر لکھے حروف کبھی نہیں مٹتے۔" ارومہ نے کھوئے کھوئے الفاظ میں کہا۔

"ارومہ! ایک بات کہوں؟" سومہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ارومہ نے سوالیہ نظروں سے سومہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارومہ' یہی کہ سجو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے وہ آج بھی...."

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"پلیز سومہ آپی! اس کا نام نہ لیں' مجھے نفرت ہے اس سے۔" اروما نے سومہ کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"ہم نے نفرتوں کو محبتوں میں بھی بدلتے دیکھا ہے۔" سومہ نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ زیر لب مسکرائی اور اس کی طرف دیکھا۔ اروما نے شاکی نظروں سے سومہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا کوئی اور بات نہیں ہے آپ کے پاس' کسی اور موضوع پر بات نہیں ہو سکتی؟"

"اس سے زیادہ اہم موضوع کیا ہو گا تمہیں کچھ احساس ہے اماں اور ابا تمہارے لیے کتنا فکر مند ہیں اور سجو نے خود مجھ سے بات کی ہے تمہارے لیے۔ تم اس کی پرانی حرکتوں کو بھول کیوں نہیں جاتیں۔ بہنوں کی شادی سے وہ فارغ ہو چکا ہے' چھوٹی صرف رملہ رہ گئی ہے۔ وہ بھی خیر سے جلد ہی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ سجو بتا رہا تھا کہ اس کا بھی رشتہ چل رہا ہے۔"

"میں تم ہی سے بات کر رہی ہوں۔ دیواروں سے تو نہیں۔ تم تو ایسی بے نیاز بنی ہوئی ہو جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہو۔" سومہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"پلیز سومہ آپی! آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" اروما نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"واہ کیسے چھوڑ دیں۔ تم تو ہمیشہ سے عقل کی کوری ہو۔ ایک ذرا سی محبت کے پیچھے خونی رشتوں کی محبت سے نظریں چرانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اماں کو رات رات بھر نیند نہیں آتی تمہاری فکر میں' ابا الگ فکر مند نظر آتے ہیں۔ اروما ایک بے وفا' بے اعتبار شخص کے لیے یوں ساری دنیا سے منہ موڑ لینا اچھی بات نہیں۔"

"نہیں سومہ آپی! اب میں کسی فریب میں نہیں آؤں گی۔ جب احمر وفا نہ کر سکے تو سجو سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ سجو صرف مجھے جھکانا چاہتا ہے اور جھکا کر اس تھپڑ کا بدلہ لینا چاہتا ہے سومہ آپی آپ بہت بھولی ہیں۔"

"پاگل' لڑکی ایک مرد کی بے وفائی کی سزا دنیا کے سارے مردوں کو تو نہیں دی جا سکتی۔ ہم ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں یہی تو ہماری بھول ہوتی ہے ہم ہر چمکتی چیز کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ سجو کی طرف سے اپنے دل سے بدگمانیاں نکال دو۔ سجو اپنی بات کا کھرا اور سچا ہے۔ آج وہ جس مقام پر ہے کہاں آوارہ گرد پھرنے والا سجو اور کہاں اب ساجد علی پروفیسر۔ اس نے دن رات محنت کی ہے۔ تمہیں پانے کی لگن نے اسے اس مقام تک پہنچایا کون جانتا تھا کہ کل کا سجو جو میٹرک کر کے مارا مارا پھرتا تھا آج اتنے بڑے معزز پیشے سے وابستہ ہو جائے گا۔ تم اسے ٹھکرا کر اس سے اس کی امنگ چھین لینا چاہتی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟" سومہ نے اپنی بات مکمل کر کے آخری جملہ بڑی تلخی سے ادا کیا۔ سومہ کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔

"آپ لوگ مجھے اتنا کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ سجو نے میری جان کیا بچالی ہے کہ میرے لیے مصیبت ہو گئی۔ کاش میں اس رات مر گئی ہوتی۔" وہ رونے بیٹھ گئی۔

"بس تمہارے پاس یہی ایک ہتھیار ہے آنسو بہائے اور اپنی بات منوالی۔ اروما ڈیئر آنسو بہانے سے

کچھ نہیں ہو گا' ٹھنڈے دل سے سوچو اور فیصلہ کرو' مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ صحیح سمت تلاش کرنا تمہارا کام ہے' کبھی کبھی ہم منزل پر پہنچ کر خود بھٹک جاتے ہیں اور اپنے کیے کا الزام قسمت کو دینے لگتے ہیں۔" سومہ بڑبڑاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ایک شام وہ آفس سے لوٹی تو اماں نے کہا "اروما' سجو چلا گیا ہے۔" اروما نے ماں کی بات پر کوئی نوٹس نہیں لیا۔ سیدھی کمرے میں چلی آئی۔ اماں بھی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"خالہ نصیبن بتا رہی تھیں سجو نے گلستان جوہر میں فلیٹ لے لیا ہے۔ ماں کو لے کر وہیں شفٹ ہو گیا ہے۔ رملہ کی شادی ہے نا عید کے چاند میں۔"

"آپ سے ملنے تو آیا ہو گا؟" اروما نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں سلام کرنے آیا تھا۔ ماں بھی ملنے آئی تھی۔ خیر سجو نے بھی بڑی ترقی کر لی کون جانتا تھا کہ سجو یوں کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔ اب تو لوگ سجو کو پروفیسر ساجد علی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دیکھو ذرا کتنا ذہین تھا کہ پہلے پرائیویٹ فرم میں جاب کی اور نائٹ کالج میں پڑھتا رہا۔ دن رات محنت کا نتیجہ ہے کہ اب وہ ایک اعلیٰ مقام پر کھڑا ہے۔" اماں اپنی ترنگ میں بولے جا رہی تھیں۔ وہ تو اٹھ کر کب کی کچن کی طرف جا چکی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اماں بیٹھی ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔

"سنو اروما کی ماں' کل اروما کی چھٹی کرا دو۔ آفس نہ جائے۔" فیروز حسن نے اچانک مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے؟" اماں نے سوالیہ نظروں سے فیروز حسن کو دیکھا۔

"ارے تم تو ایک دم بوکھلا جاتی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ کل کچھ مہمان آرہے ہیں اروما کے لیے۔" فیروز حسن نے بتایا۔

"اچھا کون لوگ ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ لڑکا کتنا پڑھا ہے؟ کام کیا کرتا ہے؟" اماں نے کئی سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔

"کرامت کا بھتیجا ہے۔"

"کون کرامت؟" اماں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا "وہی تو نہیں جو تمہارے ساتھ دکان پر....."

"ہاں وہی کرامت۔" فیروز حسن نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لڑکا موٹر میکنک ہے' اکیلا ہے' والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے' کرامت کے ساتھ ہی رہتا ہے' بھتیجے کو اولاد کی طرح پالا ہے۔ اروما کی ماں اچھا خاصا گھرانا ہے' لڑکے کو بھی میں نے دیکھا ہے' اکثر دکان پر آتا رہتا ہے بس دعا کرو یہ رشتہ طے ہو جائے تو مجھے سکون ملے اروما کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔"

"پر لڑکا پڑھا ہوا کتنا ہے؟ اپنی اروما نے تو خیر سے بی کام کیا ہوا ہے۔" اماں نے بڑے فکر سے کہا۔

"پڑھائی کے چکر میں مت پڑو' لڑکا شریف ہے' کمائی اچھی ہے' تعلیم میرے خیال میں میٹرک ہے۔ اپنا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ورک شاپ ہے' فلیٹ بک کرایا ہوا ہے اور ہمیں کیا دیکھنا ہے ارومہ کی ماں تمہارا کیا خیال ہے؟"

ماں خاموش بیٹھی سوچ میں تھی۔

ارومہ بیڈ پر لیٹی دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ تبھی اماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "نہیں ارومہ کے ابا تعلیم بھی بہت کم ہے اور کام بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"کام میں کیا برائی ہے۔ ارے نیک بخت اپنا ذاتی ورک شاپ ہے' بہت کمائی ہے اس میں۔"

"نہ جی نا' مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔" اماں نے صاف انکار کر دیا۔

"میری بلا سے جو جی چاہے کرو۔" فیروز حسن نے تیز لہجے میں کہا اور اٹھ کر ٹی وی آف کر کے دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔

"اے ہے اس سے کہیں اچھا تو سجو ہے' بھلا اس میں کیا برائی ہے۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

وہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ابا کی باتیں' سومہ کا اصرار' سجو کے لیے ساری باتیں اس کے ذہن میں چکر کھا رہی تھیں۔ اس نے جھنجلا کر آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی تو سجو کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں زیرو بلب کا مدھم اجالا پھیلا ہوا تھا۔ ارومہ کبھی کبھی ہم منزل پر پہنچ کر خود ہی بھٹک جاتے ہیں اور پھر الزام قسمت اور نصیب کو دینے لگ جاتے ہیں۔ تم سجو کی پرانی حرکتوں کو بھول کیوں نہیں جاتیں۔ اس بے وفا ہرجائی کا سوگ کب تک مناتی رہو گی۔ ایک بے وفا' بے اعتبار شخص کے لیے ساری دنیا سے منہ موڑ لینا اچھی بات نہیں۔" سومہ کے الفاظ... کی بازگشت اسے بے چین کر رہی تھی وہ جھنجلائی ہوئی کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

○☆○

پانچوں بہنیں سجو کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ شکیلہ بولی "دیکھو سجو' تم نے بھی کوشش کر کے دیکھ لیا' اماں نے بھی زور لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی صرف تمہاری خواہش' تمہاری پسند کو دیکھتے ہوئے ارومہ کی ماں سے اصرار کیا مگر اس کی ماں کیا کرے جب ارومہ راضی نہیں ہے تو' میرا خیال ہے تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔" شکیلہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پر امید نظروں سے سجو کی طرف دیکھا۔

سجو بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر بولا "شکیلہ آپا! مجھے شادی نہیں کرنی۔ کہیں نہیں کرنی چاہے وہ آپ کی نند کی بیٹی ہو یا انیلہ کی دوست شاہانہ ہو۔ مجھے کسی سے نہیں کرنی شادی۔" اس نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔

"واہ' ارومہ میں ایسے کیا ہیرے لگے ہیں۔ اب تو وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ مجھے اتنی خود سر بہو نہیں چاہیے۔ ارے اس میں تو ذرا بھی لچک نہیں آتی ہے' پتا نہیں' کس بات کا گھمنڈ ہے' بیٹا سجو میں پھر بھی تمہاری وجہ سے گئی۔ رملہ کی شادی پر بلایا' ماں باپ دونوں آئے مگر تم نے دیکھا ارومہ نہیں آئی۔ اس کے دل میں جو برائی کی گرہ ہے نا اسے تم نہیں کھول سکتے بیٹا۔ کیا فائدہ اس سے شادی کر کے تمہیں پچھتانا پڑے۔ شکیلہ کی نند کی بیٹی صوفیہ کو تو تم نے بھی دیکھا ہے' بہت پیاری ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ کیا تو چاہتا ہے کہ

میں بھولانے کی تمنا لیے قبر میں چلی جاؤں۔" ماں کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"پلیز اماں آپ تو ذرا ذرا سی بات پر رونے بیٹھ جاتی ہیں۔" سجو نے لاڈ سے ماں کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ ذرا سی بات ہے۔ شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا رہا ہے اور کہتا ہے ذرا سی بات ہے۔ بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ کیا بالکل بڈھاپے میں شادی کرے گا۔ ارے سب بہنیں خیر سے اپنے گھر کی ہو گئی ہیں تم چلے جاتے ہو تو میں اکیلی ادھر سے ادھر پھرتی رہتی ہوں' بہو آئے گی تو کچھ تو تنہائی دور ہو گی' گھر میں رونق بڑھے گی۔ پورے بتیس سال کے ہو رہے ہو تم اور ارومہ تم سے صرف تین سال چھوٹی ہے۔ ایک ہی محلے میں پلے بڑھے ہو' مجھے تو محلے کی ساری لڑکیوں اور لڑکوں کی عمریں پتا ہیں۔"

"اماں! عمر کا کیا ذکر ہے' دل آجائے تو عمر سے بڑی بھی چل جاتی ہے۔" بجیلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور کیا بات تو دل کی ٹھہری۔" رملہ نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

"اچھا یہ تو ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔" انیلہ نے اسے چھیڑتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم لوگ اپنی فضول بکواس بند نہیں کرو گی۔" سجو نے انیلہ کی طرف دیکھ کر کہا پھر ماں سے بولا "اماں! مجھے کچھ دنوں کی مہلت دیں۔ آخری کوشش کر لینے دیں۔"

"فضول ہے' کر لیں آخری کوشش۔ اس کے بعد کوئی بہانا نہیں چلے گا۔" رملہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"تم اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو۔ کبھی تو اچھی بات منہ سے نکال لیا کرو۔" وہ کہتا ہوا اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔

"ارومہ آج آفس نہیں گئی تھی۔ اماں ثمرینہ کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ کمرے میں بیٹھی اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی جس میں ان گزرے سالوں سے خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اب پلنگ کی جگہ بیڈ تھا' سامنے صوفے لگے ہوئے تھے' کارنر ٹیبل پر خوب صورت پھول دان سجا ہوا تھا' کھڑکیوں پر خوب صورت پردے پڑے ہوئے تھے کبھی اماں ان کھڑکیوں پر چادر ڈال دیا کرتی تھیں مگر اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ اللہ نے اسے اتنی اچھی جاب سے نوازا تھا کہ وہ گھر کی ساری ضروریات پوری کر کے اچھی خاصی رقم بچا لیا کرتی تھی۔ فیروز حسن کافی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس سے دکان پر بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ آئے دن بیمار رہنے لگا تھا۔ ارومہ کئی بار منع کر چکی تھی کہ اب وہ دکان پر بیٹھنا چھوڑ دے مگر باپ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ وہ بیٹھ جائے۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق تھی کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ چونکی اور اٹھ کر گئی کنڈی کھول کر واپس کمرے میں ابھی اس نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ آواز آئی۔

"میں اندر آسکتا ہوں؟" سجو کی آواز پر وہ بری طرح چونک گئی وہ تو سمجھی تھی اماں ہوں گی کنڈی کھول کر آگئی تھی۔ سجو اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

وہ تیزی سے گھومی "تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے رکے رکے لہجے میں پوچھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"اروما! مجھے تمہارے انکار سے کوئی شکوہ نہیں مگر مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارے ایک تھپڑ نے مجھے ایک سبق دیا' تمہاری وہ نفرت زدہ نظریں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ میں تمہاری ان نفرت زدہ نظروں میں محبت کی جوت جگانا چاہتا تھا۔ اس لگن نے مجھے اس مقام تک پہنچایا کہ میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا مگر افسوس ایک اچھا انسان' شریف شہری بن جانے کے باوجود میں تمہارے دل اور نظر میں کوئی مقام نہ حاصل کر سکا۔ میں تمہارے ہجر میں تڑپتا رہا مگر تمہارے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" وہ بڑے دھیمے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے تم صرف میری بدصورتی کا مذاق اڑانا چاہتے ہو' مجھ پر ایک اور احسان کر کے دنیا کی نظروں میں سرخ رو ہونا چاہتے ہو' تمہارا ایک ہی احسان مجھ پر بھاری ہے اگر کبھی موقع ملا تو وہ قرض اتار دوں گی۔" اس کا لہجہ کافی تلخ ہو گیا تھا۔

"اروما! محبت کی یوں توہین نہ کرو' میں کل بھی تم سے محبت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔ محبت ظاہری خوب صورتی ہی سے نہیں کی جاتی' محبت تو روح کی گہرائی سے کی جاتی ہے تم آج بھی میرے لیے اتنی ہی حسین ہو کیونکہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ تم نے کبھی میرے اندر جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی' تمہارے اس حسین چہرے پہ داغ میری نظر میں تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تم نے دیکھا تو ہو گا آسمان پر چمکتے ہوئے چاند میں بھی داغ ہے۔"

"بہت خوب' بہت اچھا ڈراما بول لیتے ہو۔" اروما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میرے احساسات اور جذبوں کی یوں توہین نہ کرو اروما۔" سجو نے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے مجھے کیوں اپنے جذبوں کی صداقت پر یقین تھا کہ تم مان جاؤ گی مگر آج سب سے بڑی بازی ہار کر جا رہا ہوں اروما میں تمہارے دل میں محبت کی جوت جگانے میں ناکام رہا ہوں۔"

"اروما! کبھی کبھی ہم منزل پر پہنچ کر خود بھٹک جاتے ہیں۔" سومہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔

"اروما! جہاں رہو خوش رہو۔ خدا حافظ' میں جا رہا ہوں۔" اتنا کہتے ہوئے سجو نے قدم دروازے کی طرف بڑھایا۔ اروما نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ براؤن کلر کی پینٹ' ہاف وہائٹ شرٹ میں وہ کتنا پر وقار سا لگ رہا تھا۔ آج وہ بڑا جچ رہا تھا یا یہ محبت کی نظر تھی ایک دم سے ایک لمحے میں وہ دل میں اترتا چلا گیا۔ وہ تیزی سے بڑھی۔

"رک جائیے پروفیسر ساجد علی۔"

اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اروما نے ہی پکارا ہے مگر اروما کے ہونٹوں کی کھلتی مسکراہٹ اسے سرشار کر گئی۔

"اروما کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ اروما کچھ نہ بولی کامو شی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں محبت کی جوت نمایاں تھی۔ سجو نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اروما ہم نے نفرتوں کو محبتوں میں بدلتے دیکھا ہے۔" سومہ کا کہا جملہ اس کے ذہن میں گونج اٹھا اور اس کی نظر جھکتی چلی گئی۔

○☆○

نیا جوڑا

"لو بھئی' میرا پھر ایک نیا جوڑا بننے والا ہے۔"

نویرا نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے تینوں بہنوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کبھی تو ڈھنگ کی بات کر لیا کر' یہ صبح ہی صبح جوڑے کا بھوت کہاں سے سوار ہو گیا؟" اماں اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"ہونہہ! پورا مہینا گزر گیا' دال کھاتے ہوئے اور ان کو نئے جوڑے کی سوجھ رہی ہے" سلمٰی نے شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چہک کر بولی "کچھ بھی ہو' دیکھنا میرا نیا جوڑا ضرور بنے گا اور رہی بات دال کی تو یہ کوئی نئی بات .... تو ہے نہیں۔ گوشت کا تو کبھی کبھی اتفاق ہی سے ہمارے کچن سے گزر ہو جاتا ہے' ورنہ دال نے تو باورچی خانہ اپنے نام الاٹ کرا لیا ہے۔"

"مگر جوڑا ضرور بنے گا" اسی وقت نویرا سے بڑی رضیہ چائے اور پاپے کی ٹرے لیے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"جانے دیں اماں' یہ خالی پیٹ میں ایسی ہی اونگی بونگی چھوڑا کرتی ہے" سلمٰی نے پھر کہا۔

نویرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ سب ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا چائے کی پتی کی چسکی ڈالی ہے؟ لگ رہا ہے گرم پانی پی رہے ہیں" سلمٰی نے چائے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

رقیہ بولی "آپا' بنڈل ختم ہو گیا ہے۔ ذرا سی پتی تھی' اسی کی بنالی۔ ابا تو صبح رات کی دال روٹی کھا کر' چائے پیئے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے' چائے رہنے دو' تم لوگ پی لینا۔ مجھے تو ٹھیکے دار روزانہ ایک دفعہ چائے پلا دیتا ہے۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"سلمیٰ، تم بھی کم نہیں ہو بلکہ تم سب ہی ایک جیسی ہو۔ گھر کے خستہ حالات کو جانتے بوجھتے بھی کوئی نیا جوڑا بنانے کی اطلاع دے رہی ہے تو کوئی چائے پر تبصرہ.... کسی کو روزوالیں کھانے کا رونا ہے۔ ارے شکر کرو جو مل رہا ہے۔ اللہ کا ہر حال میں شکر کرتے رہنا چاہیے۔ عزت سے روٹی مل رہی ہے، کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلا رہے۔"

اماں کی بڑبڑاہٹ شروع ہوئی تو وہ سب خاموش سی ہو گئیں۔ نویرا ابھی بے فکری سے چائے پاپے کھانے لگی۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ، یہ نیا جوڑا کون بنا رہا ہے تمہارا؟" سلمیٰ نے اپنا مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے کریدا۔

"تم بھی اس کے ساتھ پاگل پنے کی باتیں کرنا شروع ہو گئیں" اماں نے سلمیٰ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اماں، پتا تو چلے کہ آخر چکر کیا ہے؟"

"ارے چکر وکر کچھ نہیں ہے، سلمیٰ آپا! آپ نے سنا نہیں، بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں اور ہماری نویرا کو جوڑے۔" سجاد نے اندر آکر ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھلا کر بولی "اچھا سجاد بھائی! شرط لگالیں اگر عنقریب میرا نیا جوڑا نہ بنا تو میرا نام بدل دینا۔"

"عنقریب کیا، ابھی تو دور دور تک ایسے آثار نظر نہیں آرہے ہیں" رضیہ نے فوراً ہی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں، تمہیں کیا الہام ہوا ہے کہ تمہارا جوڑا بننے والا ہے؟ ارے یہ فضول باتیں سوچنا چھوڑ دو، اپنے اس دماغ کو کسی اچھے سے کام میں لگاؤ" سمیرا نے کہا۔

"آپ سب کی یادداشت بہت کمزور ہے۔ پچھلے سال میرے اوپر مکڑی چڑھ گئی تھی اور میرا نیا جوڑا اچانک بن گیا تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ اماں! کیسی احمقانہ باتیں کرنے لگی ہے نویرا!" سجاد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو آج بھی اپنی نویرا بیگم پر مکڑی صاحبہ نے سواری کرلی ہے" رقیہ بولی "کیا ہم اس قابل نہیں کہ کوئی مکڑی ہم پر بھی سواری کرے تو ہمیں بھی ایک نیا جوڑا مل جائے۔"

"اڑالو میرا مذاق! مگر تم سب دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"مجھے ایسی فضول چیزیں دیکھنے کا کوئی اشتیاق نہیں ہے" رقیہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ سلمیٰ کی طرف مڑی "یاد کریں سلمیٰ آپا!"

"یاد رکھنے کو کیا تمہاری اونگی بونگی باتیں ہی رہ گئی ہیں؟" سمیرا نے سلمیٰ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بات کاٹتے ہوئے اسے لتاڑا۔

"ہاں دیکھنا، میرا جوڑا بنے گا۔ تم کیوں تپ رہی ہو" نویرا نے تنک کر کہا۔

"اچھا، اب لڑنا شروع کردو۔ اس کا تو دماغ خراب ہے ہی مگر تم سب بھی کم نہیں ہو" اماں بولیں۔

"سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں" نویرا نے دوبارہ بولنا شروع کیا "اب دیکھو نا، آپا سلمیٰ میرے ساتھ ایسا

اتفاق ایک بار تھوڑی ہوا ہے، تین بار ایسا ہوا ہے۔"

"تین بار ہوا ہے یا چار بار۔ تم فٹافٹ میرے موزے لاؤ، دھلے کہ نہیں؟" سجاد نے اسے ٹوکا۔

"او سوری بھائی! وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہے۔ آج اسی پر گزارا کرلیں" نویرا نے ہنس کر کہا۔

سجاد بولا "تم بہت کام چور ہو۔ کبھی جو وقت پر کام کردو۔ کس قدر بدبو آرہی ہے ان موزوں میں؟"

"اماں، سجاد بھائی کی شادی کردیں۔ ہر کام ان کو وقت پر مل جائے گا" وہ پھر ہنسی۔

"بھئی میں تو چلا، آفس کو دیر ہو رہی ہے۔ ہاں آج موزے دھل جانے چاہئیں۔" سجاد کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

رقیہ چائے کے برتن سمیٹنے لگی تو نویرا بولی "اتنی جلدی کیا ہے۔ میری بات تو پوری سن لو۔ سلسلہ وہیں سے جوڑتی ہوں جہاں سے ٹوٹا تھا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "سب سے پہلے جب مکڑی میرے اوپر چڑھی تو اتفاق سے اچانک میری دوست شہلا آگئی جو انڈیا گئی تھی جو میرے لیے ایک سوٹ لائی تھی۔ اس وقت تو میں نے اس انداز میں سوچا بھی نہیں تھا مگر جب پھر ایک دن میں کچن میں جھاڑو لگا رہی تھی کہ اچانک ایک مکڑی رینگتی ہوئی میرے ہاتھ پر آگئی۔ ابھی میں نے اسے جھٹک کر گرایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پوسٹ مین ایک پارسل لایا تھا۔ کھولا تو پتا چلا کہ سپنا لان والوں نے ایک سوٹ پیس بھیجا تھا۔ ان کے انعامی مقابلے میں شامل ہو کر میں تو بھول بھی چکی تھی کہ مجھے بھی انعام مل سکتا ہے مگر مل گیا، کیوں کچھ یاد آیا؟"

اس نے اپنی بات ختم کر کے ان سب کی طرف دیکھا۔

"زیادہ بکواس نہیں کیا کر۔ کچن میں جا کر دیکھ، کیا پکنا ہے۔ مہینے کا آخری ہفتہ چل رہا ہے۔ اب تو سارے ڈبے خالی ہو چکے ہیں۔"

"اماں، یہ دالیں بھی بے وفا ہی نکلی ہیں۔ چلو گوشت مرغی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ ہم لوئر کلاس سے بے وفائیاں کرنا ان کا حق ہے مگر دالیں تو ہماری کلاس کی وفادار ہوتی ہیں، یہ بھی دغا دے گئیں۔ اب وفا کی امید کس سے کی جائے؟" نویرا نے اتنی معصومیت سے کہا کہ سلمیٰ اور اماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی تھی۔

انہوں نے نویرا کے ایک دھپ لگائی "سجاد ٹھیک کہتا ہے۔ تیری زبان مشتعل چلتی رہتی ہے۔"

"اماں، مستقبل میں مجھے لیکچرار بننا ہے نا؟" اس نے ہنس کر کہا۔

اماں بولیں "ہاں ضرور لیکچرار بنے گی۔ دماغ تو فضول باتوں میں الجھا رہتا ہے۔ اتفاقات کو گرہ سے باندھ کر کہتی ہے، مکڑی چڑھ گئی ہے، نیا جوڑا بنے گا۔ کوئی سن لے تو تجھے پاگل کہے گا، تو ہم پرست کہیں کی۔"

"لو بھلا، اس میں میرا کیا قصور ہے" یہ کہتی ہوئی وہ پھر شروع ہو گئی "پچھلے مہینے میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی تھی کہ شام کو سجاد بھائی نے مجھے پچاس روپے دے دیے۔ میں نے سب کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج میرے ساتھ میں پیسے آئیں گے۔ سیدھی آنکھ پھڑکنے لگتی ہے تو دل ہولنے لگتا ہے، کہیں نہ کہیں سے بری خبر سننے کو مل جاتی ہے۔ میں بہت چاہتی ہوں کوئی اچھی خبر سننے کو ملے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اب مکڑی ہی کو لے لو، آخر تم لوگوں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا تم لوگوں پر مکڑی کبھی نہیں چڑھی، کیا تم لوگوں کی آنکھ نہیں پھڑکتی، کیا تمہاری ہتھیلی میں کھجلی نہیں ہوتی؟" وہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سلمٰی اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی "چندا رانی! یہ سب ہمارے ساتھ بھی ہوتا ہے مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔ اصل میں ایک چیز ہوتی ہے یقین! تم ان ساری باتوں یعنی توہم پرستی پر اتنا یقین رکھتی ہو کہ واقعی وہ کچھ ہو جاتا ہے جو باتیں تم ان باتوں سے منسوب کر لیتی ہو۔"

سلمٰی نے اسے بڑے پیار سے سمجھانا چاہا تو وہ اٹھلا کر بولی۔

"اب میں کیا کروں۔ مجھے یقین ہے کہ گھر کے حالات کچھ بھی ہوں' میرا نیا جوڑا بننے کی صورت ضرور نکل آئے گی اور آپ سب دیکھتے رہ جائیں گے" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

سلمٰی' ماں کی طرف دیکھ کر مسکرائی "بڑی پاگل لڑکی ہے۔ کسی کی بات کا اثر ہی نہیں لیتی۔"

"لو' میرے پیر میں کھجلی شروع ہو گئی ہے۔ سلمٰی آپا' کہیں آپ کے سسرال سے کوئی نہ آجائے؟" وہ کچن کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر آئی تھی۔

"ارے دفع ہو یہاں سے" اماں نے غصے سے اسے جھڑک دیا پھر سلمٰی سے بولیں "لا چادر دے میری' آلو لادوں اور رقیہ! تم فٹافٹ بیٹھک کی صفائی کر لو۔ بچے سیپارہ پڑھنے آتے ہوں گے۔ سلمٰی' تم مشین لے کر بیٹھ جاؤ۔ سامنے والی فیروزہ کو شام تک سوٹ تیار کر کے دینا ہے' اسے شام کو مائیوں میں پہن کر جانا ہے۔"

"جی اماں' میں بیٹھ رہی ہوں۔"

اماں باہر سبزی لینے چلی گئیں اور وہ چاروں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

یہ لوئر مڈل کلاس کا ایک گھرانا تھا۔ چار بہنیں' ایک بھائی اور اماں ابا۔ سب ہی آپس میں میل محبت اور بے تکلفی سے رہتے تھے۔ سلمٰی سب سے بڑی تھی' اس سے چھوٹا سجاد تھا اور سجاد سے چھوٹی تین بہنیں تھیں۔ دوسرے بیٹے کی آس میں شکیلہ بانو نے سجاد کے بعد تین بیٹیاں اور اکٹھا کر لی تھیں۔ اب چاروں امربیل کی طرح ان کے شانوں سے آگے نکل گئی تھیں۔

رحمت سوئی گیس کے ٹھیکے دار کے ساتھ کام کرتا تھا جو اچھی عادت کا مخلص سا شخص تھا۔ تنخواہ کے علاوہ بھی وہ رحمت کا خیال رکھتا تھا۔ اس لیے رحمت نے اپنی کم آمدنی ہونے کے باوجود پانچوں بچوں کی تعلیم کا خیال رکھا تھا۔ اس کے لیے اسے بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ شام چھ بجے گھر آنے کے بعد سات بجے سے وہ قریبی ہوٹل میں کباب بنانے کا کام کرتا تھا جہاں سے بارہ ساڑھے بارہ بجے رات کو واپسی ہوتی تھی۔

سلمٰی اور رقیہ نے انٹر کر کے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ سمیرا سیکنڈ ائر کے ایگزام سے فارغ ہوئی تھی اور نویرا نے فرسٹ ائر کا ایگزام دیا تھا۔ مستقبل میں اس کا لیکچرار بننے کا خواب تھا مگر شکیلہ بانو جانتی تھیں کہ اس کا یہ خواب پورا ہونا مشکل ہے۔ سجاد ہی کو انہوں نے بڑی مشکل سے بی کام کرایا تھا۔ اب وہ قسمت سے ایک پرائیویٹ فرم میں لگ گیا تھا۔ ابھی اسے جاب ملے تین ہی مہینے تو ہوئے تھے۔ سلمٰی کی بات طے ہوئے دو سال ہو رہے تھے مگر وہ ابھی تک اس پوزیشن میں نہیں تھیں کہ اسے رخصت کر دیں۔

رحمت علی نے گھر میں داخل ہوتے ہی شکیلہ بانو سے کھانا نکالنے کو کہا۔

"آج دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا ہے" وہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ منہ دھونے چلے گئے۔

"رقیہ' رقیہ! فٹافٹ اپنے ابا کے لیے دو روٹیاں ڈال دے اور چاول بھی گرم کر دے۔"

سمیرا نے اماں کی آواز سنتے ہی تیز آنچ پر چاول گرم کرنے رکھ دیے۔

رحمت ہاتھ صاف کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔

"آج کیا بات ہے' باورچی خانے سے چاولوں کی خوشبو بڑی شاندار آرہی ہے' کیا بنایا ہے؟" انہوں نے زمین پر بچھی دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اماں کے کچھ کہنے سے پہلے نویرا بولی "مٹر چاول بنے ہیں اور چاول بھی باسمتی!"

"کیا کوئی آیا تھا؟" رحمت نے کہتے ہوئے سوالیہ نظروں سے شکیلہ بانو کی طرف دیکھا۔ اسی وقت رضیہ کھانے کی ٹرے لیے آگئی۔ ایک پلیٹ میں گرم گرم مٹر چاول' دو روٹیاں اور آلو انڈے کا سالن۔ اس نے ٹرے نیچے رکھ دی۔

نویرا پانی کا گلاس بھر کر لے آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔

رحمت نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا "کون آیا تھا؟"

"ابا' میں نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ کہیں آج سلمٰی آپا کے سسرال سے کوئی نہ آجائے' میرے پیر میں کھجلی ہو رہی تھی اور وہی ہوا کہ سلمٰی آپا آلو کے قتلے بنانے جا رہی تھیں کہ ان کی ساس اور نند آدھمکیں۔"

نویرا نے ماں کے کچھ بتانے سے پہلے ہی بڑی تیزی سے ساری بات بتا دی کہ آلو کے شوربے والے قتلے بنتے بنتے انڈے کا سالن اور مٹر چاول کیوں اور کیسے بنے؟

رحمت اس کی بات سن کر ہولے سے مسکرا دیے۔

"بس تم اس کی باتوں پر مسکرایا کرو۔ یہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"فضول کا غصہ کر رہی ہو۔ نویرا بیٹی کے دم سے تو اس گھر میں رونق ہے۔ سچ پوچھو تو سارے دن کی تھکن اتر جاتی ہے اس کی دلچسپ باتوں سے" ابا بولے۔

"ہاں' تم ہی نے بگاڑا ہے اسے' اس کی کچر کچر باتوں سے تمہاری ہی تھکن اترتی ہے" وہ چڑ کر بولیں "یہ بتاؤ کچھ پیسے لائے ہو' میں نے کہا تھا کہ ٹھیکے دار سے ایڈوانس لے لینا۔"

"ہاں لایا ہوں" رحمت نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "یہ لو پانچ سو روپے ہیں۔ پورا ہفتہ اسی میں نکالو۔ اب کٹ کر ڈھائی ہزار ہی ملیں گے۔"

"چلو' اللہ مالک ہے" شکیلہ بانو نے آہستہ سے کہا "آج دوپہر میں سلمٰی کی ساس اور نند آئی تھیں۔ رخصتی کے لیے کہہ رہی تھیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دوں۔ یہاں تو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کے لالے پڑ جاتے ہیں' شادی کا انتظام کہاں سے کروں؟"

رحمت یہ سن کر فکرمند ہو گیا کہ رخصتی کا تقاضا بڑھ رہا ہے پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے "سلمٰی کے سسرال والوں کو ہمارے حالات تو معلوم ہی ہیں کہ ہم.... سلمٰی کی ماں! اللہ کا نام لے کر رخصتی کرنے کا انتظام کرو۔ وہ لوگ دو سال سے اصرار کر رہے ہیں۔ ہم آج بھی خالی ہاتھ ہیں اور کل بھی خالی ہاتھ رہیں گے۔ اللہ کی بندی' اب انہیں ٹالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے' تم شادی کی تاریخ ٹھہراؤ۔ میں ٹھیکے دار سے بات کرتا ہوں' اتنی پرانی ملازمت ہے میری' کچھ تو کرے گا۔ سجاد سے بات کرو.... وہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اپنی فرم سے کچھ قرض لے لے۔ پہلی شادی ہے' کچھ تو سفید پوشی کا بھرم رکھنا ہوگا۔"

"اچھا دیکھو' آج آئے سجاد تو بات کرتی ہوں" یہ کہتے ہوئے انہوں نے نویرا پر نظر ڈالی جو پلیٹ میں بچے ہوئے چاولوں میں سے مٹر کے دانے نکال کر کھانے میں لگی ہوئی تھی۔

"کوئی تہذیب چھو کر نہیں گزری ہے اس لڑکی کو' ہر وقت دل جلانے والی حرکتیں کرتی ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ میں نے کہا تھا برتن اٹھا کر رکھ آ مگر..."

"جانے دو' یہاں کون بیٹھا ہے۔ تم بھی ذرا ذرا سی باتوں پر تنا تڑتی رہتی ہو۔"

"اماں' میرا نام اگر تہذیب ہوتا تو نام کا اثر ضرور ہوتا۔ اب نویرا نام رکھ دیا ہے تو نویرا تو نرالی حرکتیں ہی کرے گی۔ بس آج سے ہی میں اپنا نام تہذیب رکھ لیتی ہوں۔ سلمیٰ آپا! سنو' میں آج سے اپنا نام تہذیب رکھ رہی ہوں۔ آئندہ مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے۔" وہ ہنستی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکلنے لگی تو اندر داخل ہوتے ہوئے سجاد سے اتنی بری طرح ٹکرائی کہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

"ہائے میری بچی!" اماں دوڑ کر اس کے قریب آگئیں مگر نویرا تو جیسے بے ہوش پڑی تھی۔ ماں کی چیخ و پکار سے سلمیٰ' رقیہ اور سمیرا بھی کچن سے دوڑی آئیں۔

سجاد اسے آوازیں دے رہا تھا "نویرا' نویرا۔ یار ڈراما نہ کرو' اٹھ جاؤ۔ اب تم اتنی زور سے بھی نہیں گری ہو کہ بے ہوش ہی ہو جاؤ۔"

"اے سجاد دیکھ' اس کا ماتھا نیلا ہو رہا ہے۔ شاید لوہے کی چوکھٹ لگ گئی ہے۔" اماں نے کہا تو وہ بھی یہ دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔

"اماں! پریشان نہ ہوں' میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔" سلمیٰ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈال رہی تھی مگر وہ ساکت پڑی تھی۔

"ارے' سجاد کہاں چلا گیا۔ اسے اسپتال لے کر چلو" ابا نے بے بسی سے نویرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت سجاد قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو لیے گھر میں داخل ہوا۔ "اماں' آپ پریشان نہ ہوں۔ چوٹ شدید ہے' اس وجہ سے نویرا بے ہوش ہو گئی ہے۔" ڈاکٹر نویرا کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور سجاد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آئی ایم سوری' یہ تو اکسپائر ہو چکی ہیں۔ چوٹ شدید تھی۔"

"نہیں' نہیں!" ایک دل خراش چیخ پورے گھر میں پھیل گئی۔ ہنستا مسکراتا گھر آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت رخصت آگیا۔ ہر آنکھ اس اچانک موت پر نم ہو رہی تھی۔

"اماں اٹھو' ہوش میں آؤ' نویرا کا آخری دیدار کر لو" سجاد بے اختیار رو رہا تھا "سلمیٰ آپا! دیکھو' نویرا نے نیا جوڑا پہن لیا ہے۔ یہ بے داغ سفید جوڑا پہن کر کیسی مسکرا رہی ہے اپنی فتح پر۔"

"تم لوگ دیکھتے رہ جاؤ گے' جب میرا نیا جوڑا بنے گا اور میں پہنوں گی۔"

رقیہ کے کانوں میں نویرا کے صبح کے الفاظ گونج کر رہ گئے۔ وہ بے اختیار چیخ پڑی "نویرا' تجھے اتنا یقین کیوں ہو گیا تھا کہ..." الفاظ اس کے آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ آنسو اور آہوں کے قافلے کے ساتھ وہ نیا جوڑا پہن کر ایسے سفر پر روانہ ہو گئی تھی جہاں سے واپسی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

○☆○

غم کا دریا پار کیا

زندگی دکھ اور سکھ کا ایسا مجموعہ ہے کہ ایک قدم پر خوشی ملتی ہے تو دوسرے پر آنسوؤں کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ دل سے دھواں سا اٹھنے لگتا ہے مگر میری چوبیس سالہ زندگی میں کوئی غم' کوئی دکھ نہیں آیا تھا وہ میرے لیے اپنے دامن میں صرف خوشیاں ہی لائی تھی مگر آج میں اپنے کمرے میں بیٹھی دکھ اور سکھ کا تجزیہ کر رہی ہوں۔ گزشتہ دو برس میں میری زندگی چار مرحلوں سے گزری ہے۔ خوشی' غم' خوش امیدی اور پھر دکھ کے کبھی نہ ختم ہونے والے اندھیرے۔ میری زندگی کا پہلا بڑا حصہ بہت خوبصورت تھا۔ میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن اور پانچوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ سب کی لاڈلی' گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ایک بڑے پوش ایریا میں ہمارا ایک ہزار گز پر پھیلا خوب صورت بنگلا تھا جسے پاپا نے نور محل کا نام دیا تھا۔ نور محل کے مکینوں کے دم سے اس میں رونقیں تھیں۔ بڑی بھابی زاہدہ اور بھابی صفیہ اوپر کی منزل میں رہتی تھیں۔ نیچے احمد بھائی کے بیوی بچے' اظہار بھائی اور ان کی بیگم اور پھوپو شاکرہ رہتی تھیں۔ پھوپو شاکرہ کا گھر ویسے تو اسلام آباد میں تھا کیونکہ پھوپا کی گورنمنٹ جاب وہیں تھی مگر پھوپا کے انتقال کے بعد جب ان کے اکلوتے بیٹے عازم اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے تو پاپا نے پھوپو کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یوں نور محل میں اچھی خاصی بڑی فیملی آباد تھی۔ میرے چار بھائیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ بس مظہر بھائی رہ گئے تھے جو عازم کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے تھے۔ بڑے بھائی اعظم کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ بھابی صفیہ کی دو بیٹیاں' احمد بھائی اور اظہار بھائی کے بھی تین تین بچے تھے۔ پاپا کا ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ اظہار بھائی اور احمد بھائی پاپا کے اسی بزنس میں شامل تھے۔ اعظم بھائی کے ایم سی میں ایک اعلیٰ پوسٹ پر فائز تھے۔ فراز بھائی بھی پاپا کے بزنس کو ڈیل کرتے تھے اور زیادہ تر پاپا کے لاہور والے آفس میں ہوتے تھے۔ کراچی میں ان کا قیام بہت کم رہتا تھا۔

وقت بڑی سبک رفتاری سے پرواز کر رہا تھا۔ میں نے بی اے کیا تھا اور میری پہلی پوزیشن آئی تھی۔ سب خوش تھے' پاپا اور پھوپو بھی بہت خوش تھیں۔ اس دن میری کامیابی کی خوشی میں امی نے رات کے کھانے پر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہمیشہ سے زیادہ اہتمام کروایا تھا۔ گھر میں متعدد نوکرانیاں تھیں جن کے ذمے گھر کے سارے کام تھے۔ کچھ گھر کی صفائی کرتی تھیں اور دو کھانا بناتی تھیں۔ سب بھابیاں تو بس کچن میں جا کر دیکھ لیا کرتی تھیں کہ کیا پک رہا ہے کیا پکنا ہے۔ شام میں اور دوپہر کے کھانے میں کون کون سی ڈشز تیار ہوں گی۔ یہ شعبہ امی کے ذمے تھا۔

اس رات ڈائننگ ٹیبل مختلف اقسام کی ڈشز سے سجی ہوئی تھی۔ یہ ٹیبل اس قدر وسیع تھی کہ تیس پینتیس افراد آرام سے اکٹھے کھانا کھا سکتے تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ سبھی لوگ وقت پر گھر میں موجود تھے۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی پھوپی بولیں "رافیہ نے بی اے کر لیا ہے اور خیر سے عازم بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے آنے والا ہے۔ بھائی صاحب! رافیہ کو میں عازم کی دلہن بنانے کے خواب نہ جانے کب سے دیکھ رہی ہوں۔ میں چاہتی تھی' عازم پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو بات کروں اور اب ماشاء اللہ عازم نے نہ صرف تعلیم مکمل کر لی ہے بلکہ وہیں امریکا میں اسے جاب کی آفر ہو گئی ہے۔"

پاپا نے امی کی طرف دیکھا اور بولے "بھئی تمہارا کیا خیال ہے؟"

امی بولیں "خیال کیا' گھر کا لڑکا ہے اس میں سوچنا کیسا؟"

امی کا اتنا کہنا تھا کہ پھوپو کھل اٹھیں۔ میں نے وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر باہر لان میں نکل آئی۔ مجھ میں اور عازم میں کبھی اظہارِ محبت نہیں ہوا تھا مگر اظہار اور اقرار ہماری نظروں نے کر دیا تھا۔ نظروں نے ہی ایک دوسرے کے من میں جھانک لیا تھا لہٰذا الفاظ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

عازم اور مظہر بھائی جس طرح دونوں ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئے تھے' واپس بھی ایک ہی فلائٹ سے آئے تو نور محل کی رونقوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

مظہر بھائی کے لیے زور شور سے لڑکیاں ڈھونڈی جانے لگیں۔ اس شام بھی امی چاروں بھابیوں اور پھوپو کو لے کر اسی جگہ گئی تھیں جہاں پہلے بھی کئی چکر لگا چکی تھیں۔ امی کی کسی قریبی ملنے والی نے انہیں لڑکی بتائی تھی اور وہ کئی بار دیکھ لینے کے بعد ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اچھے خاصے گھرانے سے لڑکی کا تعلق تھا۔ آج امی ان سب کو لے کر اسی لیے گئی تھیں کہ یا تو انکار کر دیں گی یا پھر تاریخ طے کر کے آئیں گی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی کہ عازم آ گئے "میں اندر آ سکتا ہوں۔"

ان کا گمبھیر لہجہ میرے کانوں سے ٹکرایا تو میں نے رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "آیئے!"

عازم سامنے چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولے "یہ سارا قافلہ کہاں گیا ہوا ہے؟" انہوں نے نور محل کے سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"مظہر بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے گئے ہیں۔"

"ارے تو سب کے سب چلے گئے لڑکی دیکھنے! لڑکی والے اتنے افراد کو دیکھ کر انکار نہ کر دیں کہ صرف لڑکی دیکھنے کے لیے یہ قافلہ آیا ہے تو آ گئے...." عازم نے جملہ نامکمل چھوڑتے اور بڑی سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"امی پہلی بار تھوڑی گئی ہیں۔ کئی بار جا چکی ہیں۔ صباحت انہیں پسند بھی ہے مگر اب ان سب کو لے جا کر رائے لینا چاہتی ہیں کہ ان کا انتخاب ٹھیک ہے یا نہیں! اس کے بعد کوئی آخری فیصلہ کریں گی۔"

"اور تم کیوں نہیں گئیں؟"

"مجھے اچھا نہیں لگتا لڑکیاں اس طرح دیکھنے جانا۔ زیادہ تر امی کے ساتھ بھابی صفیہ ہی جاتی رہی ہیں۔ مجھے تو عجیب سا لگتا ہے' لڑکی کو اس طرح کھوجتی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جیسے کہ وہ بھیڑ بکری۔"

"بس بس' اب جو آگے کہنے والی ہو وہ میں خود ہی سمجھ گیا ہوں" عازم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا' پھر وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے "میں بھی کن مسئلوں میں الجھ گیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میرا ارادہ" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عازم کی طرف دیکھا۔

"بھئی قربان جایئے اس سادگی پر" عازم نے گہری مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو میں ایک دم ہی سمجھ گئی کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔

"مجھے کیا پتا؟ یہ پاپا اور پھوپو جانیں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ گھر والوں کی اس حسین سازش میں میری طرح تم بھی شامل ہو" عازم نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ ہمارے درمیان پہلی بار اس انداز میں گفتگو ہوئی تھی۔ عازم خاموشی سے گہری مسکراہٹ لبوں پر سجائے کمرے سے باہر چلے گئے اور میں آنے والے حسین سپنوں میں کھو گئی۔

○☆○

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ امی صباحت کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آئی تھیں۔ شہر کے حالات ان دنوں سازگار نہیں تھے کہ منگنی کی تقریب کو کسی بڑے پیمانے پر منایا جاتا۔ پاپا کا خیال تھا کہ شادی میں تھوڑا ہی وقفہ ہے اس لیے منگنی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔ مغرب کے بعد سڑکوں پر سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ گلیاں سڑکیں سنسان ہو جاتیں۔ روشنیوں کا شہر کراچی اندھیر نگری بنتا جا رہا تھا۔ اکثر فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں ایسے میں امی ہولنے لگتیں۔ "بس خیریت سے یہ شادی نمٹ جائے" اخبارات کی سرخیاں اور دل ہلا دیتیں۔ روزانہ مختلف علاقوں سے لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ انسانی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ ایک ایک جگہ پر نو دس افراد کا قتل روز کا معمول بن گیا تھا۔ روشنیوں کا شہر ویران ہوتا جا رہا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے پاپا نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ مظہر بھائی کی مہندی نہیں جائے گی نہ آئے گی۔ شادی سادگی سے ہو گی۔ لانگ روم میں بزرگوں کی میٹنگ بیٹھی ہوئی تھی اور یہ اس میٹنگ کا فیصلہ ہی تھا کہ نور محل کو کسی قسم کی رنگین روشنیوں سے نہیں سجایا جائے گا۔

ان دنوں نہ صرف دہشت گرد قتلِ عام کر رہے تھے بلکہ شادی والے گھروں پر ڈاکے بھی ڈال رہے تھے۔ طے یہی پایا کہ پہلے مظہر بھائی کی دلہن رخصت ہو کر آئے گی اور پھر ولیمے والے دن میری رخصتی ہو گی۔ میری برات کا بھی عجب قصہ تھا کہیں دور سے برات نہیں آنا تھی اسی نور محل سے ہمیں قریبی شادی ہال جانا تھا وہیں سے دلہن کے روپ میں مجھے رخصت ہو کر نور محل واپس آنا تھا۔ ایک ہفتے بعد عازم اور پھوپو کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہونا تھا اور ایک ماہ کی چھٹی پوری ہوتے ہی عازم کو امریکا روانہ ہو جانا تھا۔ بعد کا پروگرام یہی تھا کہ وہ میرا اور پھوپو کا ویزا بھیجتے۔ مجھے اور پھوپو کو بھی امریکا چلے جانا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

○☆○

نور محل میں ویسے ہی رونق لگی رہتی تھی اور اب تو گھر میں دو شادیاں تھیں۔ ایک ہفتے پہلے ہی ساری کزنز ڈھولک لے کر بیٹھ گئی تھیں مگر پاپا نے سختی سے منع کیا کہ ڈھولک اتنی آواز سے نہ بجائی جائے کہ باہر تک آواز سنائی دے۔ اکثر ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ ہی دور سے آتی فائرنگ کی آوازیں سب کو خوف زدہ کر دیتیں اور ڈھولک کی تھاپ مدھم پڑ جاتی۔ تالیاں بجاتے ہاتھ رک جاتے، ہنستی مسکراتی لڑکیوں اور بچوں کے چہروں پر اداسی چھا جاتی اور میں اپنے رب سے دعا کرنے لگتی "اے رب کریم! سب کو اپنی امان میں رکھ!"

○☆○

شادی ہال رنگین روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج میری شادی تھی اور مظہر بھائی کا دعوت ولیمہ۔ ان کی دلہن صباحت کومل سی تھی۔ امی کے انتخاب کے سبھی داد دے رہے تھے۔

اسٹیج پر میں بھی دلہن کے روپ میں سرخ بھاری راجستھانی غرارہ سوٹ میں بنی سنوری بیٹھی تھی۔ مجھ پر بھی تمام دلہنوں کی طرح آج کچھ زیادہ ہی نکھار آیا تھا۔ زرق برق آنچل لہرا رہے تھے مگر چہروں پر وہ زندہ دلی اور رونق نظر نہیں آرہی تھی۔ سب بجھے بجھے اور خوف زدہ سے چہرے تھے' پاپا نے بڑے پیمانے پر شادی کے کارڈ بھجوائے تھے مگر ہال میں بہت کم مہمان نظر آرہے تھے۔ اس دن صبح ہی سے شہر کے حالات بہت زیادہ خراب تھے۔ شہر کی فضا اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کئی جگہ فائرنگ کی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ پاپا نے کچھ سوچ کر دلہن دولہا کی گاڑی بھی نہیں سجوائی تھی۔ نکاح ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد فارغ ہو کر نور محل پہنچنا چاہتے تھے مگر شادی میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ نکاح کے بعد پُر تکلف کھانا اور پھر دولہا دلہن کی رسمیں شروع ہو گئیں۔

عازم میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کریم کلر کی شیروانی میں ہمیشہ سے زیادہ وجیہہ لگ رہے تھے۔ تبھی پاپا نے آکر کہا "شاکرہ! رخصتی کراؤ۔ کافی دیر ہو رہی ہے۔ حالات ویسے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ باقی رسمیں گھر جا کر کر لینا۔"

پاپا کا حکم ملتے ہی پھوپو اٹھ گئیں۔ امی نے بھابی سے کہا "قرآن مجید لے کر آؤ۔"

چھوٹی بھابی پہلے ہی قرآن مجید لیے کھڑی تھیں "جی امی! میرے پاس ہے" انہوں نے کہا۔

روایتی دلہنوں کی طرح میں اپنی کزنز' فرینڈز' بھابیوں' پانچوں بھائیوں اور ماں باپ کے جھرمٹ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جس میں مجھے نور محل جانا تھا۔ عازم میرے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہے تھے۔ کتنے حسین لمحے تھے۔ مووی کیمرے مستقل مووی بنانے میں مصروف تھے۔ ابھی میرے قدم گاڑی کے بالکل نزدیک پہنچے ہی تھے اور اعظم بھائی نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک قیامت بپا ہو گئی۔ دہشت گردوں نے ہال میں گھس کا فائر کھول دیا۔ ہر طرف چیخ پکار تھی۔ وہ فائرنگ کر کے گاڑی میں فرار ہو گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ گھبراہٹ میں' میں نے اپنا سر اونچا ڈالا۔ سر اہٹا تو میں نے دیکھا' عازم خون میں لت پت نیچے کی طرف گر رہے تھے۔ اعظم بھائی بھی زخمی تھے۔ امی کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کتنے لوگ اس فائرنگ سے زخمی ہو گئے تھے۔ میں خوف سے چیخی اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

تین دن بعد ہوش آیا تو جہاں نور محل میں ہنسی اور قہقہے گونجا کرتے تھے' وہاں دبی دبی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہر طرف اگر بتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں بری طرح چونک گئی۔ میری کلائیاں خالی تھیں۔ میرے جسم پر سفید چادر تھی "تو کیا عازم...!" عازم کا خیال آتے ہی میری نظر بڑی بھابی کی طرف اٹھ گئی وہ سفید لباس میں اجڑی سوگوار ایک کونے میں بیٹھی تھیں۔ میں شدت غم سے پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ ستم گر دہشت گردوں نے مجھ سے میرا عازم ہی نہیں چھینا تھا' مجھ سے میرا بھائی اعظم' بھابی سے ان کا سہاگ' چار بچوں سے باپ کا سایہ چھین لیا تھا۔ میں بھابی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد گھر میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔

بیٹے کی جدائی نے پاپا کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ بت بنے بیٹھے اس غم کو... اندر سمونے کی کوشش کر رہے تھے۔ تسلی کے دو لفظ مجھ سے کہنے کے لیے ان کے ہونٹ تھرتھرائے مگر ان کی آواز زندہ نہ گئی۔ ان میں کچھ کہنے کا حوصلہ نہ تھا۔ پھوپی کو جوان بیٹے کی جدائی نے نیم پاگل سا کر دیا تھا۔ ہمارے نور محل کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔

○☆○

امی میری بدقسمتی پر کڑھتی رہتیں۔ میں وہ بدنصیب دلہن تھی جو رخصت ہونے سے پہلے ہی بیوگی کا داغ لگا بیٹھی تھی۔ ہر آنکھ اس المیے سے اشکبار تھی۔

اخبارات میں وہی جھوٹی تسلیاں دی جا رہی تھیں کہ دہشت گردوں کی تلاش جاری ہے۔ انہیں سخت ترین سزا دی جائے گی۔ یہ تسلیاں نہ تو میرے زخموں پر مرہم رکھ سکتی تھیں اور نہ ہی میرا سہاگ واپس لا سکتی تھیں اور نہ ہی میرا بھائی مجھے مل سکتا تھا۔

میرے بھائی اور میرے شوہر عازم کو دہشت گردوں نے کس لیے مار دیا؟ نہ تو یہ لوگ کسی تنظیم میں شامل تھے اور نہ ہی ان کی کسی سے دشمنی تھی۔ اس فائرنگ میں اور بھی کئی افراد زخمی ہوئے تھے۔

نور محل میں خزاؤں نے ڈیرا جما لیا تھا۔ پاپا بیٹے کی موت کا زخم زیادہ عرصے نہ سہار سکے اور ایک دن اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے کے سبب وہیں چلے گئے جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔

○☆○

وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ مظہر بھائی اپنی دلہن صباحت کے ساتھ امریکا چلے گئے۔ پاپا کے ایکسپورٹ کے بزنس کو جس طرح پہلے اظہار بھائی' احمد بھائی اور فراز بھائی سنبھال رہے تھے' اب اور زیادہ ذمے داری سے سنبھالنے لگے کہ اب پاپا دنیا میں نہیں تھے اور یہ بزنس ان ہی تینوں بھائیوں نے مل کر چلانا تھا۔ انہی دنوں میری دوست کی برتھ ڈے پر میری ملاقات راحیل عبید سے ہو گئی۔ راحیل عبید میری دوست عمرانہ کے شوہر کا دوست تھا۔ راحیل عبید نے مجھے دیکھا اور چند دن بعد ہی اس کا رشتہ میرے لیے آگیا۔ گھر میں ایک بار پھر میٹنگ بیٹھ گئی۔ اس بار اس میٹنگ میں پاپا اور اعظم بھائی موجود نہیں تھے۔ پورا سال گزر گیا تھا اور دہشت گردوں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی اور ستم یہ کہ صرف سال بھر بعد ہی میرا رشتہ راحیل عبید کی طرف سے آگیا تھا۔ رشتہ عمرانہ اور اس کا شوہر زاہد لے کر آئے تھے۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"زاہد! تم راحیل عبید کو کب سے جانتے ہو؟" امی نے پوچھا۔

"ارے خالہ! راحیل عبید نے میرے ساتھ ہی بی کام کیا تھا اور پھر آپ تو جانتی ہیں یہاں ڈگری لینے والے ہمارے نوجوان بھی بے روزگار نظر آتے ہیں۔ راحیل یہاں کی بے حسی سے تنگ آکر اٹلی چلا گیا تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست ہے جس کی مدد سے جلد ہی راحیل کو ملازمت مل گئی۔ راحیل کے والدین بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ راحیل نے بہت برے دن بھی دیکھے ہیں مگر اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی ہوئی تھی اور اب تو اس کا مستقبل روشن ہے۔ اکیلا ہے' گلستان جوہر میں پانچ کمروں کا خوبصورت فلیٹ ہے۔ سب سے بڑی بات خالہ یہ کہ راحیل کو ہم نے تمام بات بتادی ہے مگر وہ بخوشی اس شادی کے لیے تیار ہے۔"

"اچھا تو پھریوں کرتے ہیں' تم مجھے راحیل عبید سے ملواؤ' ہم اپنے طور پر چھان بین کرلیں پھر فیصلہ کریں گے" اظہار بھائی نے کہا۔

اور پھر چند دن کے بعد ہی فیصلہ راحیل عبید کے حق میں ہوگیا۔ میں دوسری شادی کرنے کے لیے تیار نہ تھی مگر امی بولیں "رافیہ! ابھی تمہاری پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں چاہتی ہوں بیٹا کہ تم اپنے گھر میں آباد ہوجاؤ۔"

"پلیز امی! میں اس موضوع پر کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"مگر بیٹا! ہم راحیل عبید کو زبان دے چکے ہیں۔ بیٹا' راحیل اچھا لڑکا ہے' تعلیم یافتہ ہے' خوبصورت ہے اور خاندانی ہے۔"

"رافیہ! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم کسی پر بوجھ نہیں ہو مگر بیٹا' عورت کی زندگی مرد کے سہارے کے بغیر بہت دشوار ہوجاتی ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ اتنا اچھا رشتہ آیا ہے۔ تمہیں اس نے خود پسند کیا ہے' کیا یہ کم ہے؟"

○☆○

نور محل میں ایک بار پھر رونق اتر آئی مگر میں نے امی کو یہ بتادیا تھا کہ ڈھول نہیں بجے گی' زیادہ مہمان نہیں آئیں گی۔ میں نے آپ سب کی خوشی کے لیے سادگی سے نکاح کروں گی۔ میں نے اپنے دل' اپنے ذہن کو اس کے لیے کس طرح تیار کیا ہے' یہ کوئی میرے دل میں جھانک کر دیکھے۔"

"ٹھیک ہے' ہم راحیل سے بات کرلیں گے" بھابی نے کہا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ راحیل عبید نے ہر بات مان لی تھی۔ وہ اپنی برات کے ساتھ عمرانہ اور زاہد کے علاوہ چند دوستوں کو لایا تھا۔ امی نے قریبی رشتے داروں کو مدعو کیا تھا۔ رات کے نو بجے میں بنی سنوری' دلہن کے روپ میں راحیل عبید کے ساتھ رخصت کردی گئی۔ راحیل کے ساتھ آئے مہمان عمرانہ وغیرہ اپنے گھر چلے گئے تھے۔

راحیل مجھے اپنے ساتھ لیے اس گھر کے اندر داخل ہوئے جہاں میرا استقبال کرنے والا کوئی فرد موجود نہیں تھا۔ وہ مجھے لے کر اپنی خواب گاہ میں آگئے۔ پورے کمرے میں تازہ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بہت مسرور نظر آرہے تھے' کچھ سوچتے ہوئے بولے "رافیہ! یہ نور محل کے برابر تو نہیں ہے' چھوٹا سا گھر ہے

جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے اسی لیے میں نے تمہاری امی کو کہا تھا کہ کسی قسم کا جہیز وغیرہ نہیں چاہیے مگر پھر بھی انہوں نے مجھے ایک لاکھ روپے سلامی دے دی۔ ارے میں تو بھول ہی گیا۔ آپ بیٹھیں! کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی" راحیل نے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں میرا دل اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔ خدا جانے کیوں میرا دل اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی۔ یہاں آتے ہی میرا دم گھٹنے لگا تھا یا میں ایسا محسوس کررہی تھی۔

"ارے ٹھیک سے دلہنوں کی طرح اوپر ہوکر بیٹھیں" راحیل نے ایک شوخ نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا مگر میں ہر جذبے سے عاری تھی۔ وہ خود بیڈ کے کونے پر ٹک گئے۔ میں نے دیکھا' اچانک ان کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمایاں ہوگئی تھیں۔ میں کچھ سمجھ نہ سکی اور پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ پرکھ رہے ہوں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔

مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ میں بولی "آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

میرے سوال پر وہ بری طرح چونکے پھر میری طرف جھکتے ہوئے بولے "رافیہ! ضمیر کی خلش نے اتنے کچوکے لگائے ہیں کہ اب یہ میری برداشت سے باہر ہوگئے تھے۔ جبھی میں نے یہ قدم اٹھایا اور آج تم میری دلہن بنی میرے کمرے میں موجود ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ جو کچھ میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں' اسے تم سمجھ رہی ہو یا نہیں مگر آج میں تمہارے سامنے وہ سارے اعتراف کروں گا جو میرے ضمیر کا بوجھ بن گئے ہیں مگر پہلا اعتراف ان سے مختلف ہے اور وہ پہلا اعتراف یہ ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ نہ جانے کتنی راتیں تمہارے ہجر و فراق میں گزاری ہیں اور اب دوسرا اعتراف! میری محبت کی ابتدا اس رات کی صبح سے ہوئی تھی جس رات میرے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے تھے اور تمہارا شریکِ حیات خون میں نہا گیا تھا اور میں اپنے گروہ کے ساتھ فرار ہوگیا تھا۔"

یہ الفاظ تھے کہ نشتر جو میرے دل کو چھلنی کرتے چلے گئے۔ ذہن چیخ کر رہ گیا۔ عبید کا مذاق اتنا بھیانک تھا کہ مجھے سکتہ سا ہونے لگا۔ میرے لب خاموش تھے اور وہ بول رہا تھا "دوسرے دن اخبار کی سرخیاں تمہاری دلہن بنی تصویر کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔" دہشت گردوں نے شادی ہال میں گھس کر فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں دولھا اور دلہن کا ایک بھائی موقع پر ہلاک ہوگئے۔ مقتول سے دشمنی تھی جس کی وجہ سے دہشت گردوں نے گولیوں کا نشانہ بنادیا۔ "یہ خبر من گھڑت تھی یا قیاس آرائی۔ اس رات مجھے باس کو جو کوٹا دینا تھا' اس میں ہم ناکام رہے تھے۔ اتفاق تھا کہ ہماری گاڑی اس ہال کے قریب سے گزری اور ہم نے ارادہ کرلیا کہ یہاں فائرنگ کرکے ہم وہ کوٹا بڑی آسانی سے پورا کرسکتے ہیں اور ہم نے اس وقت فائر کھول دیے' جب تم رخصت ہورہی تھیں۔ رافیہ! میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ وقت اور حالات نے مجھے دہشت گرد بننے پر مجبور کردیا۔ زاہد نے جو کچھ بتایا تھا' وہ سچ تھا۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا ہوگیا تھا۔"

میری سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں اور وہ مسلسل بولے جارہا تھا "رافیہ! میں ۱۹۹۱ء میں بحری جہاز کے ذریعے اٹلی گیا تھا۔ میری ملازمت بحری جہاز پر تھی مگر جب میں نے لوگوں سے سنا کہ اٹلی کی حکومت ایک اسکیم کے ذریعے غیر ملکیوں کو کام کے لیے کاغذات جاری کرنے والی ہے جس سے ہر غیر ملکی قانونی طور پر یہاں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مقیم ہو جائے گا اور اسے شہریت مل جائے گی۔ اٹلی میں کام بہت تھا‘ میں نے خاموشی سے بحری جہاز کی ملازمت چھوڑدی اور غیر قانونی طور پر اٹلی آگیا۔ وہاں محنت مزدوری کرنے لگا۔ اس دوران میں میرا جھگڑا ہوگیا اور میرے ہاتھوں ایک مقامی آدمی کا قتل ہوگیا تو اس وقت میری ملاقات راجیش سے ہوئی جو بھارت کا رہنے والا تھا مگر اٹلی کا شہری بھی تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی‘ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی اور اپنے آفس میں ملازمت بھی دی۔ وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے غیر قانونی کام بھی لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ میں غیر قانونی کام کی دلدل میں دھنستا چلا گیا اور پھر مجھ کو ہر قسم کا اسلحہ چلانے کی تربیت دی گئی۔ پھر مجھے دہشت گردی کی مکمل تربیت کے لیے اٹلی کی مافیا تنظیم نے فرانس بھیجا۔ جب میں نے اپنی تربیت مکمل کرلی اور اٹلی واپس آیا تو مجھ کو دنیا کے ہر حصے میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کے بعد آخر کار انہوں نے مجھے پاکستان میں دہشت گردی کے لیے بھیجا۔ کئی سال بعد جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو میرا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ لمبی سی داڑھی تھی اور ایک رخسار پر میں نے ماسک سے زخم کا گہرا نشان سا بنالیا تھا تاکہ مجھے یہاں کوئی پہچان نہ لے۔ یہاں آکر میں نے ایک مافیا جیسی تنظیم میں شامل ہوگیا۔ کوئی بھی مجھے نہ پہچان سکا کہ میں وہی راحیل عبید ہوں جو پڑھ لکھ کر معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آدمی جب برے کاموں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اس کا ضمیر خود بخود سو جاتا ہے۔ میں نے بھی قتل اور ڈکیتی کی بے شمار کامیاب وارداتیں کیں اور اپنے باس کے سامنے ہمیشہ سرخرو رہا۔ اس رات بھی میں سرخرو ہوگیا تھا مگر اس رات کی صبح میری سوچ کا دھارا بدل چکی تھی۔ سویا ہوا ضمیر اچانک ہی بیدار ہوگیا تھا۔ تمہاری صورت دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ پچھتاوے کا زہر میرے اندر پھیلنے لگا کہ یہ میں نے کیا‘ کیا؟ تب میں نے تنظیم سے فرار حاصل کرنے کے منصوبے بنانے شروع کردیے تاکہ میں تم سے شادی کرکے اس گناہ کا کفارہ ادا کرسکوں۔ نہ جانے میرا دل تمہاری طرف کیوں کھنچا چلا جارہا تھا۔ شاید محبت اسی کا نام ہے۔ پہلی بار میں اس درد سے آشنا ہوا۔ تمہیں پانے کی جستجو بڑھتی جارہی تھی۔ پھر میں نے باس سے کہا‘ کچھ دن کے لیے میں روپوش ہونا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ پر بہت اعتبار کرتا تھا مگر کہنے لگا ”شہکی! روپوش ہوجاؤ مگر یاد رکھنا‘ کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ تنظیم کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“

اس نے مجھے دھمکی دی تو میں نے مسکرا کر کہا ”کیسی بات کرتے ہو باس! تنظیم میں شامل ہونے پر فرار کے سارے راستے خود بخود بند ہوجاتے ہیں۔“

”سمجھ دار ہو“ وہ مسکرایا۔

میں روپوش ہوگیا اور ایک بار پھر اپنا حلیہ تبدیل کرلیا۔ اب میں کلین شیو تھا۔ شہکی مر گیا تھا اور راحیل عبید زندہ ہوگیا تھا۔ کئی مہینے ادھر ادھر روپوش رہا۔ واپسی کی معیاد ختم ہونے لگی تو میں پریشان تھا کہ کہیں مجھے تنظیم تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوجائے مگر شاید خوش قسمتی میرے ساتھ تھی۔ پورا سال گزر گیا تو مجھے اطمینان ہوا پھر بھی میں محتاط رہا اور پھر اچانک زاہد سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں تمہارے گھر تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ راستہ خود بخود بنتا چلا گیا۔ تم زاہد کے گھر ملیں اور یوں میں تمہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے خوشی ہے رافیہ‘ کہ خدا نے یہ موقع دیا تاکہ میں اپنے گناہوں کی تلافی کرسکوں۔ میں

تمہارا مجرم ہوں اور تمہارے سامنے میں نے سارے جرائم کا اعتراف کیا ہے۔ رافیہ! صرف تین دن بعد ہم یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے۔ ہم ہنی مون سوئٹزرلینڈ میں منائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے اس مجرم کو معاف کردو گی۔ تم سے میں معافی کا طلب گار ہوں“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے میرے آگے جھکا ہوا تھا۔

میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں‘ بگولے سے میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ میں ہولے ہولے کانپ رہی تھی‘ میرے سامنے میرے عازم کا قاتل کھڑا تھا‘ میرے سامنے میرے بھائی کا قاتل کھڑا تھا‘ میرے سامنے میرے وطن کا غدار کھڑا تھا۔ ہر مجرم ہمیشہ اپنی مظلومیت کی کہانی سناتا ہے۔ وہ بھی سنا چکا تھا۔ زندگی مجھے اس موڑ پر لے آئے گی‘ یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ میرا ہی مجرم میرے شوہر کے روپ میں کھڑا مجھ سے معافی کا طلب گار تھا۔ فیصلہ کرنا بہت دشوار تھا۔ ایک طرف میرا اس کا نازک رشتہ تھا جس میں‘ میں چند گھنٹے پہلے بندھی تھی۔ دوسری طرف وہ ایک بڑا دہشت گرد تھا‘ وہ صرف میرا ہی مجرم نہیں تھا‘ نہ جانے کتنی بہنوں‘ کتنی ماؤں اور کتنے معصوم بچوں کا مجرم تھا۔ تب میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اپنی دلی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے‘ مجھے کچھ دیر سوچنے کی مہلت دو۔ اب تمہارے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ چکی ہوں تو تمہیں معاف تو کرنا ہی پڑے گا مگر ابھی میرا دل قابو میں نہیں ہے۔ راحیل عبید! مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔“

”ضرور‘ ضرور بلکہ تھوڑی دیر آرام کرکے سوچو‘ میں باہر چلا جاتا ہوں۔“

راحیل عبید خوشی سے سرشار کمرے سے باہر چلا گیا تو دوسرے لمحے فون کا ریسیور میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے بہت جلدی میں یہ سب کچھ کرنا پڑا تھا۔ زندگی نے مجھے ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کردیا تھا کہ ایک نئی نویلی دلہن ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے پولیس کا ایمرجنسی پندرہ نمبر ملایا تھا اور پھر ریسیور رکھ کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد راحیل عبید کمرے میں آگیا اور بولا ”تم نے کیا سوچا رافیہ!“

ابھی میں کچھ کہنے والی تھی کہ پولیس موبائل کے سائرن فلیٹ کے چاروں طرف سے سنائی دینے لگے۔

راحیل نے چونک کر میری طرف دیکھا ”یہ تم نے کیا‘ کیا رافیہ!“

”وہی کیا شہکی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ ایک قاتل اور مجرم ہو شہکی اور زندگی بھر شہکی ہی رہو گے‘ راحیل عبید کبھی نہیں بن سکتے۔“

میری آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ اسی لمحے پولیس اندر گھس آئی۔ شہکی نے فلیٹ کی کھڑکی سے چھلانگ لگادی مگر اس کے بھاگنے کی کوشش کو پولیس کے فائر نے ناکام بنا دیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی۔ پولیس انسپکٹر نے میرا بیان قلم بند کیا اور چلا گیا۔ میں واپس نور محل آگئی۔ صبح کے اخبار کی شہ سرخی میری نظر سے گزری ”ایک بڑا دہشت گرد شہکی کل رات پولیس مقابلے میں ہلاک“ اس بار میری آنکھوں میں نہ کوئی آنسو تھا نہ کوئی ملال۔ شکوہ تھا تو زندگی سے کہ اس نے مجھے کس موڑ پر لا کر کھڑا کردیا تھا۔

○☆○

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

خزاں کی رت سنہری ہے

"کچھ سنا تم نے' تمہارے ابا کو بھی ہری ہری سوجھتی ہے۔" رشیدہ بانو بڑبڑاتی ہوئی سبزی کا تھال لیے تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ جو بیٹھی چاول بین رہی تھی اس نے چونک کرماں کی طرف دیکھا۔ اماں ہربات میں محاورے خوب استعمال کرتی ہیں۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

"میں تم سے ہی مخاطب ہوں"گھنی" ماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بولی "جی ماں' آپ نے کچھ مجھ سے کہا۔

"نہیں چندا' میں تو دیواروں سے باتیں کررہی ہوں۔ ارے یہاں کوئی اور موجود ہے جو پوچھ رہی ہے کہ مجھ سے کچھ کہا۔" رشیدہ بانو نے کھاجانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پر اماں ہوا کیا ہے' اب تک تو میری سمجھ میں اتنا ہی آیا ہے کہ ابا کو ہری ہری سوجھتی ہے' اتنا ہی سنا ہے میں نے۔ اور یہ پرانی بات ہوگئی بقول آپ کے کہ اکثر و بیشتر ہری ہری...." وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر دوبارہ چاول صاف کرنے میں لگ گئی۔

"یہ آج کی تاریخ میں چاول صاف ہوجائیں گے؟" اماں اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"اماں تھوڑے سے تو رہ گئے ہیں۔ چاولوں میں اتنا باجرہ ملا ہوا ہے کہ آنکھیں دکھ گئیں نکال نکال کر۔"

"اماں کیا بتا رہیں تھیں' ابا کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے اماں کا بگڑتا موڈ دیکھتے ہوئے وہی بات چھیڑ دی جس کا ذکر کچھ دیر پہلے لیے بیٹھی تھیں۔ اس کے سوال کرتے ہی بولیں۔

"ارے سدرہ تمہارے ابا تو سٹھیا گئے ہیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہمارا ہی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے کہ تمہارے ابا نے ایک مہمان کی اطلاع دے دی ہے۔ فیصل آباد میں تمہارے ابا کے کوئی دوست ہیں' ان کا بیٹا کراچی سے آرہا ہے اور تمہارے ابا کی ضد ہے کہ یہیں رہے گا۔"

"تو اماں کیا ہوا' مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔" سدرہ نے جھٹ کہا تو وہ بولیں۔

"ہاں مجھے بھی پتا ہے مگر گھر میں گنجائش بھی تو ہو۔ تین جوان بیٹیاں موجود ہیں۔ ایرے غیرے لڑکے کو گھر میں رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ یہ چار کمروں کا مکان پہلے ہی ہمارے لیے چھوٹا پڑتا ہے۔"

"اماں' گنجائش تو دلوں میں ہونا چاہیے۔ جگہ خود بخود نکل آتی ہے۔" اماں اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ اوپر والا کمرا اس کے لیے سیٹ کردو۔ وہ کل شام کو آرہا ہے۔"

"مگر اماں وہ کمرا تو ہم بہنوں کا ہے۔ اماں ہم کہاں جائیں گے نیچے کے چاروں کمروں میں تو کہیں اتنی جگہ نہیں ہے' بھابی کا جہیز ہی اتنا تھا کہ دو کمرے تو ان کے پاس چلے گئے۔ ایک آپ کا اور ابا کا رہ گیا۔ رہ گیا بے چارہ ڈرائنگ روم تو اسے کیا کباڑ خانہ بنانا ہے جو ہم اپنا کمرا چھوڑ کر نیچے آجائیں۔" سدرہ کی زبان بڑی تیزی سے چلتی دیکھ کر رشیدہ بانو بولیں۔

"بھئی میں کیا جانوں مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔" اماں نے اس کا ہی جملہ دھرایا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"اے لو مغرب ہونے کو ہے۔ یہ دلہن بیگم اور لڑکیاں ابھی تک نہیں لوٹیں۔"

"اماں آج کل بازار میں رش بھی تو بہت ہے۔ رمضان شروع ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ رمضان سے پہلے خریداری کرلے۔" وہ چاول کی ٹرے لیے کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ اسی لمحے وہ سب کی سب ہاتھوں میں شاپر اٹھائے گھر میں داخل ہوئیں۔

"توبہ ہے' اماں جان اتنا رش ہے کہ چلنا دشوار ہے۔" بھاوج نے ساس کے قریب تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے اماں اتنا رش ہے کہ میں تو خوار ہوگئی۔" ماہم بولی۔

"سدرہ ذرا ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔ حلق خشک ہورہا ہے۔ بوتل ادھر ہی لے آؤ۔" بھابی نے کہا اور شاپر میں سے سامان نکالنے لگیں۔

"یہ دیکھیں اماں' میری چندری کی ساری اور جناب! یہ ہے میرا سوٹ" انم نے سدرہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ شلوار قمیص کا تھری پیس سوٹ بہت خوبصورت تھا۔ ڈارک بلو اور فیروزی کلر کے شیڈ پر کامدانی کا بہت خوبصورت کام بنا ہوا تھا۔

"اماں' میں نے کامدانی کا اس لیے لے لیا کہ شہلا کی شادی عید کے فوراً بعد ہے۔ اس میں بھی کام آجائے گا۔"

"ہاں' آپ تو جو سوٹ لاتی ہیں' یہی کہتی ہیں' یہ شہلا کی شادی پر کام آجائے گا" سدرہ نے ہنستے ہوئے کہا تو اماں نے اسے گھورا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے' اب تمہاری طرح تھوڑی ہے کہ شادیوں میں پہننے کے لیے الگ سے لاؤں گی اور عید کے لیے الگ" اماں نے اسے لتاڑا۔

"ارے سدرہ' شام کے کھانے میں کیا بنا رہی ہو؟" بھابی نے اس کا موڈ آف ہوتے دیکھ کر' ہنس کر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

پوچھا۔

"بھئی دال چاول اور سبزی۔ چلو ماہم' تم فٹافٹ سبزی بھگارو' میں چاول دھونے جارہی ہوں۔ بھیا آتے ہی کھانا طلب کریں گے۔"

"تم چلو سدرہ' میں آرہی ہوں کچن میں" بھابی نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے کہا تو رشیدہ بانو بولیں۔

"اے دلہن' تم نے کچھ سنا' کل شام ایک مہمان بھی تو آرہا ہے۔ تمہارے ابا جان کے دوست کا بیٹا فیصل آباد سے آرہا ہے اور یہیں ہمارے گھر میں ٹھہرے گا۔"

"یہاں.... مگر..." بھابی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ان تینوں کو اپنا کمرا خالی کرنا ہے۔"

"لو بھلا' کمرا خالی کرنا آسان ہے۔ دو الماریاں' بیڈ' ایک دیوان سب ہی کچھ تو وہاں موجود ہے۔ کمرا کیا' اسٹور لگتا ہے اور پھر ہم کدھر جائیں گے؟" انم کے لہجے سے فکر نمایاں تھی۔

"بھئی' کہیں نہ کہیں تو جائیں گے۔ تھوڑے دن تکلیف اٹھائیں گے۔ الماریاں ادھر ہی رہنے دیں گے۔ کچھ اپنا سامان نیچے لے آئیں گے۔ رہ گیا سونے کا مسئلہ تو ڈرائنگ روم میں نیچے بستر لگا کر سو جائیں گے" سدرہ نے فوراً اپنا مفت مشورہ پیش کیا۔

"واہ' یہ کیا بات ہوئی۔ ابا کو سوچنا چاہیے تھا کہ گھر میں گنجائش کہاں ہے۔"

"ارے انم آپی' آپ نے افسانوں میں نہیں پڑھا کہ بھئی ذرا گیسٹ روم کی صفائی کر دینا' مہمان ٹھہرے گا اور جناب! افسانے کی ہیروئن صاحبہ گھر کی آیا کے ساتھ مل کر گیسٹ روم کی صفائی کراتی ہے۔ ہلکے تازہ پھولوں کا گلدستہ بھی کارنر ٹیبل پر لگا دیتی ہیں۔" سدرہ نے بڑی سادگی سے کہا تو انم نے اسے گھورا۔

"تم افسانے پڑھ پڑھ کر خوابوں کی دنیا میں نہ رہا کرو' یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے' سمجھیں.... اور پھر رمضان شروع ہو رہے ہیں۔ افطار اور سحری میں ایک مسئلہ رہے گا۔"

"ارے انم آپی! کیسی باتیں کر رہی ہیں' افطار اور سحری کرانا تو ثواب کا کام ہے اور آپ اس ثواب سے...."

"تم یہاں سے جاؤ' مستقل بک بک کیے جارہی ہو۔" انم کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔ ویسے ہی یہ سنتے... وہ پریشان ہو گئی تھی کہ اسے کل اوپر کا کمرا خالی کرنا ہے۔

"لگتا ہے سدرہ کی ان سے خاص رشتے داری ہے' جبھی ووٹ ان کے حق میں دیے جارہی ہے۔" ماہم نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ جھٹ بولی۔

"مجھے کیا' میں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ہوگا وہی جو ابا چاہیں گے۔ ہائے ویلا مچانے سے کیا فائدہ۔" بھابی کے چہرے پر ایک دم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آنے تو دو' خوشی سے کیا پتا وہ کمبل ہو جائیں اور ڈبل عید کر کے جائیں۔"

ان کے ذو معنی جملے پر اماں بری طرح چونکیں۔ "ارے ہاں' اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ میں نے یوں تو سوچا ہی نہ تھا۔ اللہ بندے کے لیے کس طرح سے وسیلہ پیدا کرتا ہے' یہ تو وہی جانے۔ لڑکیو! کل وہ کمرا

صاف ہو جانا چاہیے۔ ایک الماری نیچے دلہن کے کمرے میں آجائے گی' دوسری برآمدے میں رکھ دیں گے۔ باقی بیڈ وغیرہ تو ادھر ہی رہے گا۔ کل صبح ہی تم دونوں لگ جانا' شام تک کمرا ٹھیک طرح سیٹ ہونا چاہیے۔"

سدرہ ماں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اماں کا ووٹ اتنی جلدی ایک اجنبی مہمان کے حق میں کیسے چلا گیا۔ وہ سوچتی ہوئی کچن کی طرف بھاگی۔ دال جلنے کی بو آرہی تھی۔

دوسرے دن شام میں کمرا مکمل سیٹ ہو گیا تھا۔ انم اور ماہم نے مل کر کمرے کی سیٹنگ ہی بدل ڈالی تھی۔ عید کے لیے جو پردے تیار ہوئے تھے' وہ رشیدہ بانو نے آج ہی کمرے میں لگوا دیے تھے۔ اس دن تو اماں کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ابا کو ہری ہری سوجھتی ہے مگر اب اماں کو کون سی سوجھ رہی ہے' وہ سوچ کر رہ گئی' بولی کچھ نہیں۔

بھابی کمرا دیکھنے اوپر آگئی تھیں۔ "لو' اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیے تم نے۔ اپنا کمرا سیٹ کر دیا مہمان کے لیے؟"

"بھابی! کیا کریں' یہ مہمان تو بلائے جان بن گیا ہے۔ ابھی تو موصوف آئے نہیں ہیں اور ان کے آنے سے پہلے اتنا کچھ کیا جارہا ہے' آجائیں گے تو اللہ ہی مالک ہے۔ اماں کہا کرتی ہیں' یہ سب کچھ اماں ہی کے حکم پر تو ہوا ہے۔ اماں بھی اوپر چلی آئیں۔ وہ سب مل کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بھابی بولیں "اماں جان! کچھ پتا ہے' موصوف کس سلسلے میں آرہے ہیں' کیا کرتے ہیں؟"

بھابی نے کریدا تو اماں بولیں "تمہیں تو پتا ہی ہے' تمہارے ابا ہمیشہ ادھوری بات کرتے ہیں۔ صرف آنے کا بتایا ہے اور کچھ بتایا ہی نہیں۔"

وہ سب باتیں کرتی نیچے اترنے لگیں جبھی وقار گھر میں داخل ہوئے۔

"پورا قافلہ اوپر پہنچا ہوا ہے اور نیچے دروازہ چوپٹ کھلا چھوڑ رکھا ہے' چاہے کوئی بھی گھس آئے" وقار نے ان سبھوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو اماں بولیں۔

"یہ سدرہ کا کارنامہ ہے۔ دروازہ کھلا چھوڑنے کی اسی کی عادت ہے اور ویسے بھی جب سب اوپر اکٹھا جاتے ہیں تو میں خاص کر نیچے کا دروازہ بند کراتی ہوں۔"

"تو اماں' اوپر کون سا بندر کا تماشا لگا ہوا ہے جو سب کے سب ادھر ہی پہنچ گئے تھے؟" وقار نے جھنجلاتے ہوئے کہا تو بھابی بولیں۔

"اوپر ان لوگوں کا کمرا خالی ہوا ہے نا' وہی سیٹ ہوا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" وقار نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیگم زہرہ کی طرف دیکھا۔

اماں خلافِ معمول ہنستے ہوئے بولیں "تمہارے ابا کے دوست کا بیٹا عادل آج رات آرہا ہے اور یہیں رکے گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اعتراض نہیں ہے۔" وقار نے کہا تو سدرہ بولی۔

"بھیا! اعتراض تو بہت تھا مگر بھابی نے نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اماں تو...."

"ارے' بہت بولتی ہے تو' دیکھ جا کر کچن میں' ہانڈی جلنے کی بو آرہی ہے۔ ایک تو یہ جب بھی کچھ پکاتی ہے'

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جلاتی ضرور ہے" اماں بڑبڑائیں۔

سب دسترخوان پر موجود تھے' گرم گرم تندور کی روٹیاں وقار لیتے ہوئے آئے تھے۔ اچار گوشت انم نے بنایا تھا' بھابی نے مٹر چاول۔ کھانے کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ابا کو چاول بہت پسند تھے' چاہے سالن بنے یا دال سبزی چاول ہونا ضروری تھا۔

"ابا! یہ عادل کون ہے؟" وقار نے اپنی پلیٹ میں مٹر چاول نکالتے ہوئے پوچھا۔

"رشیدہ! تمہیں یاد تو ہوگا' جب ہم لوگ گلبرگ میں رہتے تھے' تمہارے پڑوسی رئیس احمد تھے۔ ان کو تو تم اچھی طرح جانتی ہوگی۔ وہی' جن کی بڑی بیٹی کا نکاح فون پر ہوا تھا اور وہ ایک ماہ بعد رخصت ہو کر امریکا چلی گئی تھی؟"

"ہاں ہاں' یاد آیا.... اچھا سا نام تھا اس کا.... انیلہ...."

"ہاں وہی' عادل انیلہ کا چھوٹا بھائی ہے۔ خیر سے بڑا ہونہار نکلا ہے۔ فیصل آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اچانک اس کا ٹرانسفر کراچی یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔"

"تو کیا رئیس ہمدانی وغیرہ فیصل آباد چلے گئے تھے؟" رشیدہ بانو نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' عقیل کو وہاں اچھی جاب مل گئی تھی پھر عادل بھی وہیں بھائی کے پاس رہ رہا تھا اور وہیں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے لیکچرار کی جاب بھی مل گئی اور رئیس ہمدانی مستقل ادھر ہی چلے گئے تھے۔ وہ تو پچھلے ہفتے اپنے کسی کام کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے تو آفس سے آتے ہوئے میری ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ تو کل چلے گئے۔ وہیں تفصیلی بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ عادل آرہا ہے۔ وہ تو ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرتا مگر میں نے ہی اصرار کیا کہ نہیں' جب ہمارا گھر ہے تو ہوٹل میں رہنے کی کیا ضرورت' آخر پڑوسی ہوں۔ پڑوسی ہونے کا کچھ تو حق ادا کرنے دو ہمیں پھر وہ بھلا میری بات ٹال سکتے تھے۔" ابا نے اپنی .... بات مکمل کر کے پانی کا بھرا گلاس منہ سے لگا لیا۔

سدرہ بولی "بھئی' مجھے تو فائدہ ہوگا' میں کم از کم ان سے اپنی پڑھائی میں ہیلپ لے لیا کروں گی۔ ویسے بھی وہ ہماری ہی یونیورسٹی میں ٹرانسفر ہو کر آرہے ہیں' فائدہ ہی فائدہ ہے" وہ چہکی۔

بھابی مسکرائیں "تم خوب اپنے مطلب کی سوچا کرتی ہو۔"

"اچھا' میں تو چلتا ہوں۔ اسے اسٹیشن لینے جانا ہے" وہ جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ وقار نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر ہاتھ میں چمڑے کا سوٹ کیس لیے ایک خوبرو سا نوجوان کھڑا تھا۔

"السلام علیکم! فرید احمد صاحب کا گھر یہی ہے۔ مجھے عادل ہمدانی کہتے ہیں۔"

"اوہ' آئی سی! آپ بالکل درست جگہ پر آئے ہیں۔ ابھی آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ بس ابا نکلنے ہی والے تھے۔" وقار عادل کو لیے اندر آگئے۔ اتنی دیر میں انم دسترخوان سمیٹ کر کچن کی طرف جا چکی تھی۔ وقار عادل کو لیے برآمدے سے ہوتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اماں بھی اٹھ کر ادھر ہی آگئی تھیں۔

"السلام علیکم!" وہ اماں سے مخاطب تھا۔

"جیتے رہو بیٹا! اور سب گھر والے کیسے ہیں؟" اماں کی باتیں شروع ہو چکی تھیں۔ پھر انہیں ایک دم کچھ

خیال آیا تو وہ تیزی سے کچن کی طرف چلی آئیں جہاں انم کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔

"انم' دیکھ فریج میں ابلی ہوئی مرغی رکھی ہے۔ ذرا فٹافٹ فرائی کر لو' کھانے کا وقت ہے۔"

"امی! پہلے معلوم تو کر لیں' کیا پتا وہ کھانا کھا چکے ہوں۔ رات کے دس بج رہے ہیں" وہ بڑبڑاتی ہوئی فریج کی طرف بڑھی تھی کہ سدرہ آگئی۔

"رہنے دیں انم آپی! عادل کھانا کھا کر آئے ہیں۔"

"میں تو اماں سے پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ کھا لیا ہوگا۔"

"ہاں' وہ تو ٹھیک ہے مگر اماں کہہ رہی ہیں سبز چائے بنا دیں۔" سدرہ نے جاتے جاتے کہا تو وہ بولی۔

"کتنے کپ.... آپی بھی موجود ہیں' محفل جمی ہوئی ہے" وہ کہتی چھپاک سے چلی گئی۔ وہ کچن کا ادھورا کام چھوڑ کر چائے بنانے میں لگ گئی۔

وہ چائے لے کر پہنچی تو وہاں سامنے ہی صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔ "آداب!" انم نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

بھابی بولیں "عادل! یہ انم ہیں' وقار سے چھوٹی اور سدرہ اور ماہم سے بڑی۔ ماشاءاللہ بی ایس سی کیا ہے۔ اب فارغ ہیں" بھابی نے اس کا تفصیلی تعارف کرایا۔

انم کو بھابی کا یہ انداز عجیب سا لگ رہا تھا۔ انم چائے رکھ کر جانے لگی۔

"انم! کہاں جا رہی ہو' بیٹھ جاؤ۔" انم خاموشی سے صوفے پر ٹک گئی۔ عادل نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر وہ وقار سے باتیں کرنے لگا۔ کافی رات گئے تک محفل جمی رہی۔ انم تو اٹھ کر بھابی کے کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سدرہ اور ماہم بھی ادھر چلی آئیں۔

"چلیے انم آپی' ڈرائنگ روم خالی ہو گیا ہے۔"

"کیا سو گئیں انم؟" بھابی نے پکارا تو وہ ایک دم اٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں' ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ سارا دن سامان ادھر سے ادھر رکھ کر تھک گئی ہوں۔ اتنی تھکن ہو رہی ہے۔ نیند کیا خاک آئے گی' ویسے ہی اپنے کمرے سے دربدر تو ہو گئے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے انتہا بے زاری تھی۔ وہ منہ بناتے بھابی کے کمرے سے باہر آگئی۔

چند دنوں میں عادل ہمدانی ان سب میں اس طرح گھل مل گئے تھے۔ لگتا تھا وہ اسی گھر کے فرد ہیں۔ صبح وہ یونیورسٹی چلے جاتے۔ ڈھائی بجے واپسی ہوتی تھی۔ سدرہ کی اکثر واپسی عادل کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ یوں سدرہ بہت جلد عادل سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا سدرہ ٹرے سجا کر اوپر ہی دے آتی تھی۔ مگر شام کے کھانے پر عادل سب کے ساتھ نیچے ہی دسترخوان پر موجود ہوتے اور کھانے کے دوران باتوں کا سلسلہ چل نکلتا۔ وقار کہتے "میں تو عادل کو پہلی بار دیکھ کر پہچانا بھی نہیں تھا کیونکہ میرے خیال میں جب ہم لوگوں نے وہ مکان چھوڑا تھا تو شاید عادل میٹرک میں تھے۔"

"نہیں' میں انٹر کر چکا تھا۔ ویسے بھی میں زیادہ تر ظفر بھائی کے پاس رہتا تھا' فیصل آباد میں۔ چھٹیوں پر ہی کراچی آتا تھا۔ اس لیے بھی میں خود آپ لوگوں سے بہت کم واقف تھا۔ بابا نے جب مجھے کہا کہ کراچی جا رہے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہو تو فرید احمد کے گھر رکنا' انہوں نے تمہیں بہت خلوص سے اپنے یہاں رکنے کا اصرار کیا ہے اور کسی کے خلوص کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ بابا کا اصرار تھا ورنہ میرا ارادہ بالکل نہیں تھا مگر اب یہاں آکر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے برسوں کی جان پہچان ہے۔" عادل نے سامنے بیٹھی سدرہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا تو رشیدہ بانو بولیں۔

"بیٹا عادل' پہچان تو ایک عرصے کی ہے' یہ حقیقت ہے۔ لو میں تو بھول گئی' صبح تمہارے جانے کے بعد جمیلہ بہن کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں عادل کا دل لگا کہ نہیں اور مکان کیا کیا ہوا۔ میں نے کہہ دیا' مکان کی تلاش تو اب عید بعد ہی شروع ہوگی۔ آدھا رمضان تو گزر گیا ہے۔ ویسے بھی ابھی گیارہ بجے تک دوبارہ فون آئے گا۔"

"آنٹی! اور سب تو گھر پر خیریت ہے نا؟" عادل نے پوچھا تو وہ بولیں۔

"ہاں بیٹا! سب خیریت ہے۔ تم خود ہی فون کر لیا کرو' تمہارا اپنا ہی گھر ہے یہ بھی' تم تو تکلف برتتے ہو۔"

ارے جا ماہم! عادل کے لیے چائے تو بنا جا کر۔ بھئی' کھانے کے بعد مجھے بھی چائے کی بڑی طلب ہوتی ہے۔" اماں اٹھتے ہوئے بولیں۔

وہ سب بھی کھانے سے فارغ ہو کر ٹی وی لاؤنج میں آگئے تھے۔

"ماہم! آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟" عادل ماہم سے مخاطب تھے۔

"بس عادل بھائی! بچوں کے ساتھ دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ نرسری کے بچوں کو گائیڈ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"ارے تو آپ ہی کو بڑا شوق تھا ٹیچنگ کا۔ اماں نے تو اجازت ہی بڑی مشکل سے دی تھی۔" سدرہ کی زبان معمول کے مطابق چل چکی تھی۔

عادل ہولے سے مسکرا دیے۔

"عادل! میرا خیال ہے کہ یہ یونیورسٹی سے آتے ہوئے بھی مستقل بولتی رہتی ہوگی" بھابی نے کہا تو وہ بولے۔

"نہیں' راستے میں کیا' یہ تو یونیورسٹی میں کم سخن کے نام سے مشہور ہیں۔ زبان تو ان کی صرف گھر میں چلتی ہے مگر آپ کے گھر میں انم سب سے زیادہ خاموش رہتی ہیں۔" عادل نے کہا تو بھابی بولیں۔

"یہ جو دو ہیں نا' ماہم اور سدرہ' ان کی زبانیں اتنا چلتی ہیں کہ انم کو تو موقع ہی نہیں ملتا بولنے کا۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" وقار نے اپنی بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جھٹ بولیں۔

"بھئی' اب میں اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرتی کیا اچھی لگوں گی۔ آپ ہی کچھ اظہار فرمایئے!" بھابی نے کچھ اس طرح کہا کہ عادل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک لمحے میں سدرہ' عادل سے کافی امپریس ہوگئی تھی۔ گریس فل شخصیت ہی ایسی تھی جس سے متاثر نہ ہونا ممکن تھا۔ وجیہہ سایہ مہمان' اس کے دل میں گھر بنا بیٹھا تھا اور جب سے اسے یہ احساس ہوا تھا کہ بہت چپکے سے اچانک وہ اس کے من میں بس گیا ہے تو وہ اس سے بات کرتے ہوئے گھبرانے لگی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی سے آکر زیادہ تر کمرے میں لیٹی سوچا کرتی' عادل ہمدانی کے بارے میں کہ نہ جانے اس کے دل میں کیا

ہے؟ وہ یک طرفہ محبت کی آگ میں سلگ رہی تھی۔

○☆○

رات کافی گزر چکی تھی۔ نیند انم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے سحری بنانے کے لیے بھی اٹھنا تھا مگر نیند آنکھوں سے نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ اندھیرے میں خاموش لیٹی اماں کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہی تھی جو آج صبح ہی ابا سے کہہ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے عادل اپنی انم کے لیے کیسا رہے گا' خیر سے دیکھا بھالا لڑکا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خیال ہے عادل انم ہی کا ہم عمر ہے۔"

"ارے یہ تو ہمیں پتا ہے نا' میرے خیال میں تو ایک دو سال چھوٹا ہی ہوگا مگر دیکھنے میں تو بڑا لگتا ہے" اماں نے کہا تو ابا بولے۔

"عادل کی ماں کو تو عمروں کا اندازہ ہوگا۔ انہوں نے بھی تو ہمارے سب بچوں کو دیکھا ہوا ہے۔"

"دیکھو' کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ انم کی پچھلی منگنی نہ ٹوٹی ہوتی تو اب تک اس کی شادی کو بھی تین سال ہو گئے ہوتے۔"

"چھوڑو رشیدہ! کیوں پرانی باتیں یاد کر کے دل چھوٹا کرتی ہو' اللہ جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے۔"

"میں سوچ رہی ہوں' دلہن بیگم سے کہوں' باتوں باتوں میں عادل سے انم کے بارے میں خیال معلوم کریں۔ وہ بھاوج ہے' اگر اپنے منہ سے بھی کہہ دے گی تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

"ہاں' وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے' عادل کے گھر والے بھی یہاں آجائیں پھر سوچیں گے۔"

"ارے' تم تو سٹھیا گئے ہو۔ اچھے لڑکے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور میرے خیال میں تو عادل کی ماں کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ ماشاء اللہ انم خوبصورت' تعلیم یافتہ اور خوب سیرت ہے' پہلے بڑی کا ہو تو دوسری کے بارے میں بھی غور کریں۔"

انم نے سوچتے ہوئے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر عادل کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

سدرہ کا جملہ اس کے کانوں میں گونجا "آپی' آپ نے افسانوں میں نہیں پڑھا کہ ہیرو کی اچانک انٹری اسی طرح ہوتی ہے' مہمان بن کر آتے ہیں اور دل کے مہمان بن جاتے ہیں۔" انم کے لبوں پر آپ ہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

رات بھر وہ حسین خوابوں کی راہ گزر سے گزرتی رہی سحری میں بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ بھابی نے اسے آکر جگایا "اٹھ جاؤ یار! سحری کا وقت بہت کم رہ گیا ہے' تم تو آج ہاتھی گھوڑے بیچ کر سوئی ہو۔"

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی "ارے بھابی' تو آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں" وہ کہتی ہوئی واش روم کی طرف چلی گئی۔

آج سدرہ اور عادل یونیورسٹی سے کافی لیٹ گھر پہنچے تھے۔ رشیدہ بانو بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں "نہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جانے آج دیر کیوں ہوگئی۔ میرا تو دل ہول رہا تھا۔" اماں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی کہا تو عادل بولے۔

"میرے کولیگ نے اپنی منگنی کا ٹریٹ دیا تھا' بس وہیں چلے گئے تھے۔ سدرہ میرے ساتھ تھیں تو انہیں بھی جانا پڑا۔"

"تو فون کر دیتے بیٹا!"

"ہاں اماں' اس کا تو خیال ہی نہیں آیا" سدرہ نے ایک دم چہکتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ آج اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اسے اپنی محبت کا جواب مل گیا تھا۔ وہ جس محبت میں سلگ رہی تھی' اس کی آنچ عادل تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ اس کی زلف کا اسیر ہوگیا تھا۔ آج اسے حالِ دل کہنے کا موقع مل گیا تھا اور سدرہ اس کے دل نشین محبت سے چور لہجے میں گم ہوگئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا' وہ بولتا رہے اور وہ صرف سنتی رہے۔ زندگی میں اچانک بہت خوبصورت رنگ بھر گئے تھے۔ خوشی اور شادمانی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ آج کل وہ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ جاتی اور بس لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیے عادل کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔

"کیا بات ہے' آج کل بڑا نیند کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ سدرہ بیگم! کیا چکر ہے' بہت اڑی اڑی پھر رہی ہو۔" بھابی بیگم کی نظریں بہت تیز تھیں۔ وہ سدرہ کے گلاب جیسے کھلے چہرے کو کئی دن سے نوٹ کر رہی تھیں۔

"ارے بھابی' آپ تو فضول سی بات سوچنے لگتی ہیں۔" وہ بھابی کا اشارہ سمجھ کر ہنس کر بولی تو بھابی بھی مسکرا کر رہ گئیں۔

"بھئی' میں نے تو کچھ نہیں کہا' تم نے کیوں ایسا سوچا کہ میں ایسا سوچ رہی ہوں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ بھابی خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اور اس شام افطار کے بعد عادل نے بتایا کہ انہیں مکان مل گیا ہے اور وہ دو دن بعد وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ اگلے ہفتے ان کی فیملی بھی فیصل آباد سے کراچی پہنچ جائے گی۔

"مگر بیٹا' تم نے تو ذکر ہی نہیں کیا کہ تمہیں....."

"وہ آنٹی! میرے کولیگ ہیں' ان کا مکان گلشن میں خالی ہے' وہی کرائے پر لیا ہے اور یہ کل ہی ملا ہے۔ تو رات میں نے فون پر پاپا کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے وہ لوگ اگلے ہفتے پہنچ جائیں گے۔"

"میرا تو خیال تھا ابھی کیا ضرورت تھی' عید بعد دیکھ لیتے مکان۔ عید تو ہمارے ساتھ ہی کر لیتے" بھابی نے کہا تو عادل بولے۔

"بے فکر رہیے' عید ہم سب لوگ مل کر کریں گے اور ای کو آنے دیں' پھر وہی کچھ بات کریں گی۔" عادل نے گول مول جواب دیا تو اماں کے چہرے پر سکون سا چھا گیا۔ وہ سمجھیں' بھابی نے کوئی ذکر کیا ہوگا' انم کے سلسلے میں جبھی عادل نے اس طرح کی بات کی ہے۔

عادل اٹھ کر اوپر چلے گئے تو انہوں نے پوچھا "دلہن بیگم! کیا تم نے عادل سے وہ بات کی تھی جو میں نے کہی تھی؟"

"نہیں اماں' موقع ہی نہیں ملا۔ میں سوچ رہی ہوں سدرہ سے کہوں' وہ تو ساتھ آتی جاتی ہے' آسانی سے

بات کر لے گی۔" بھابی نے کہا تو سدرہ نے ایک دم چونک کر بھابی کی طرف دیکھا۔

"کون سی بات؟" اس وقت ماہم اور انم کچن میں تھیں۔ لاؤنج میں اماں' سدرہ اور صرف بھابی موجود تھیں۔ اماں نے خود ہی سدرہ سے کہا۔

"سدرہ! عادل کے گھر والے آنے والے ہیں۔ ذرا باتوں باتوں میں انم کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کرنا۔ سدرہ' میرا اور تمہارے ابا کا ارادہ ہے انم کا رشتہ عادل سے طے کرنے کا مگر یہ سب کچھ جبھی ہوگا جب عادل کی مرضی ہوگی تو اس کے گھر والے بھی راضی ہو جائیں گے۔ تم اس سے بات تو کر کے دیکھو سدرہ!" ماں نے ڈائریکٹ اس سے کہا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اس نے اپنے بکھرتے ہوئے وجود کو سنبھالا۔

"اماں' موقع ملا تو کل ہی بات کروں گی" نہ جانے کس دل سے اور کیسے اس نے اتنا بڑا وعدہ کر لیا تھا' وہ بھی اماں سے۔

"جوڑ تو ماہم کے لیے اچھا ہے مگر میں چاہتی ہوں انم کی ہو جائے تو میرے دل کو سکون مل جائے گا کہ بڑی پار لگ گئی۔" اماں اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں اور وہ بہت آہستہ سے' تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر کمرے میں جانے لگی تو عادل اور وقار نیچے آتے نظر آئے۔

"کہاں چلیں سدرہ! ذرا چائے تو بناؤ اور یہ دونوں کدھر ہیں؟" انہوں نے انم اور ماہم کو پوچھا۔

"وہ دونوں تو سونے کے لیے چلی گئی ہیں۔" بھابی نے بتایا۔

وقار بولے "ارے ابھی سے' کل تو ویک اینڈ ہے اور ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے' صرف ساڑھے دس بجے ہیں۔ بھئی عادل کو شاعری کا شوق اٹھا ہے' ہو جائے بیت بازی۔ بلا کر تو لاؤ ان دونوں کو۔" سدرہ نے وقار کے کہنے پر کچن میں جاتے ہوئے ماہم اور انم کو آواز لگائی۔

وہ دونوں ہی گھبرا کر کمرے سے باہر آگئیں "کیا ہوا؟"

"ارے کچھ بھی نہیں ہوا البتہ کچھ دیر بعد بیت بازی کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ ذرا سدرہ چائے بنا کر لے آئے۔ آجاؤ بھئی' تم بھی" وقار نے بیگم کو پکارا۔ بھابی' اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو رہنے دیں' مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ تینوں ہی شاعری کی دیوانی اور خاص کر سدرہ کی تو ڈائری بھری پڑی ہے۔" بھابی کہتی ہوئی دوبارہ آکر بیٹھ گئیں۔

"ہاں' یہ ہوئی نا بات۔ کوئی داد دینے والا بھی تو ہو" وہ سب بیٹھے تھے' سدرہ چائے لیے آگئی۔

"آجاؤ سدرہ میدان میں۔ آج عادل کے ساتھ بیت بازی کا مقابلہ ہے۔" اس کی پلکوں کے کنارے نم ہو رہے تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا "نہ جانے کیا آنکھ میں پڑ گیا ہے' جلن سی ہو رہی ہے" وہ کہتے ہوئے سامنے چیئر پر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو سب پہلے کوئی اچھی سی غزل یا نظم عادل سنائیں گے۔"

عادل نے بڑے گمبھیر لہجے میں امجد اسلام امجد کے کچھ شعر سنانے شروع کیے۔ ان کی نظر سدرہ پر لگی ہوئی تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

محبت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سننے سے نہیں تھکی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو
ایسے بس ایک ہی دھن ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے

عادل خاموش ہوئے تو بھابی بولیں "بہت خوب۔ چلو بھئی' اب کون میدان میں آرہا ہے۔" انہوں نے انم کی طرف دیکھا۔

انم ہولے سے مسکرائی "مجھے تو اس وقت ایک شعر بھی یاد نہیں آرہا' میرے خیال میں سدرہ! تم ہی کچھ سنادو۔" انم نے کہا تو سدرہ نے ایک نظر انم کو دیکھا پھر ایک نظر عادل پر ڈال کر حسبِ حال سنانے لگی۔

آگ پر چلنا بھی تو پڑتا ہے
اور ہجر میں جلنا بھی تو پڑتا ہے

محبتوں میں اکثر

ایک نہ ایک دن بچھڑنا بھی تو پڑتا ہے
آنکھوں میں خواب بھی اترتے ہیں
سانسوں میں گلاب بھی مہکتے ہیں

محبتوں میں اکثر

جسم وجاں پر عذاب بھی اترتے ہیں
کبھی خوشیاں کبھی غم بھی ملتے ہیں
کبھی آنسو بھی پینا پڑتے ہیں

محبتوں میں اکثر

دل کے زخم بھی سہنا پڑتے ہیں
غضب چھیڑتی ہیں تنہائیاں بھی
ہوجاتی ہے مقدر رسوائیاں بھی

محبتوں میں اکثر

کھو جاتی ہیں شناسائیاں بھی
حائل ہوتی ہے کبھی دوری بھی
بنتی ہے کبھی کوئی مجبوری بھی

محبتوں میں اکثر

جدائی ہوتی ہے ضروری بھی

دن بھی کاٹے نہیں کٹتا
دل بھی بہلنے نہیں بہلتا

محبتوں میں اکثر

کوئی مل کر بھی نہیں ملتا

محبتوں میں اکثر

اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔ عادل نے اسے بہت گہری نظر سے دیکھا۔ وہ بہت اپ سیٹ سی نظر آرہی تھی۔ سب اس کو داد دینے میں لگے ہوئے تھے۔ "بھئی میدان مار لیا ہماری سدرہ نے۔" اور عادل پریشان سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آج تو اسے محبتوں کے اعتراف سے چور کوئی حسب حال نظم' غزل سنانی تھی۔ اتنی مایوس کن شاعری سنا کر اس نے انہیں بے چین سا کردیا تھا۔ ابھی وصل کی گھڑی سے پہلے بچھڑنے کا ذکر کہاں سے اور کیوں آگیا؟

"کیا ہوگیا عادل' تم تو ہارنے کا ملال کرنے لگے۔ ارے شاعری کے انتخاب میں اپنی سدرہ سے کوئی بازی نہیں جیت سکتا' کئی بار یونیورسٹی کے بیت بازی کے مقابلے میں ٹرافی حاصل کرچکی ہے۔ وقار نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"میرے خیال میں چلنا چاہیے' بارہ بج رہے ہیں۔"

"لو تم تو میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہو" بھابی نے ایک دم کہا تو وہ بولے۔

"بے فکر رہئے' میدان چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔" عادل نے اوپر جاتے جاتے پلٹ کر ذومعنی جملہ کہا۔ انم اور بھابی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیں۔

سدرہ سونے کے لیے خاموشی سے ڈرائنگ روم کی طرف جاچکی تھی۔ انم اور ماہم کمرے میں آئیں تو وہ اندھیرا کیے لیٹ چکی تھی۔ انم اس کے برابر میں آکر لیٹ گئی۔ ماہم آج کل صوفے پر سو رہی تھی۔ صبح اٹھتے ہی پہلے ڈرائنگ روم کو سیٹ کرنا پڑتا تھا۔ انم خاموش لیٹی تھی' اس کی سوچیں عادل کے محور کے گرد گھوم رہی تھیں۔ سدرہ دوسری طرف کروٹ لیے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی اس کی محبت کا پودا ابھی ہرا بھرا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی محبت کا گلشن خزاں کی زد میں آچکا تھا۔ وہ تو کسی گنتی میں شمار ہی نہیں تھی۔ اماں نے اس سے اس کی قیمتی چیز مانگ لی تھی اس کی زندگی کا حاصل۔ اور اس نے وعدہ کرلیا تھا۔ کیا وہ ایسا کرسکے گی' کیا وہ اپنی محبت کی قربانی دے سکے گی؟ وہ تو سب سے چھوٹی تھی۔ اماں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی شروع نہیں کیا تھا۔ اماں اس کی دل کے حال سے بے خبر کتنی آسانی سے کہہ رہی تھیں۔ جوڑ تو ماہم کا بھی ہے مگر میں چاہتی ہوں انم پار لگ جائے۔ وہ سوچتی رہی' رات بھر اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

وہ بے خبر سو رہی تھی' اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ماہم نے اسے اٹھانا چاہا تو ایک دم چونک گئی' اسے تو بہت تیز بخار ہے۔ انم آپی' بھابی اور اماں بھی ادھر ہی آگئیں۔ وہ بے سود پڑی تھی' برف کے پانی کی پٹیاں رکھو' بخار ایک سو چار کی ڈگری سے کم نہیں لگ رہا ہے۔ ان لوگوں کے بولنے کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بھابی اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ سدرہ' ذرا یہ تھرمامیٹر لگانا' تم تو بخار میں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

پھنک رہی ہو۔ اور ان کا خیال درست تھا۔ اسے ایک سو چار ڈگری بخار تھا۔ اماں تو ہولنے لگی تھیں۔ بھابی نے جلدی جلدی برف کی پٹیاں رکھ کر بخار کی شدت پر قابو پالیا تھا۔ "آج ویک اینڈ ہے' کوئی قریبی کلینک بھی نہیں کھلا ہے" انم نے کہا تو وہ نقاہت سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"پریشان نہ ہوں' بخار ہی تو ہے' ٹھیک ہو جائے گا" وقار اور عادل بھی ادھر ہی آگئے تھے۔

"بھئی سدرہ! یہ تمہاری شاعری نے تو سب کو پریشان کر دیا اور تم بخار چڑھا کر بیٹھ گئیں۔"

"نظر ہو گئی' اتنی شاندار شاعری سنانے پر اور میرا خیال ہے' عادل بھائی کی نظر لگ گئی ہے۔ کیونکہ مات تو سدرہ نے انہی کو دی تھی۔ ان کی نظم کے جواب میں۔"

سدرہ نے تیزی سے ہونٹ کاٹ ڈالے۔ اس نے نظر اٹھا کر عادل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کسی اور کی امانت بننے والا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔

"اماں' میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے" وہ نڈھال سی ہو کر دوبارہ لیٹ گئی۔

اماں اس کے قریب ہی بیٹھ کر محبت سے اس کا سر دبانے لگیں۔ "بیٹا' کیوں رو رہی ہو' ٹھیک ہو جائے گی طبیعت۔ دلہن! بخار کا سیرپ میرے کمرے میں رکھا ہے' وہ لے کر آؤ اور ہاں ماہم' تم تھوڑا سا ناشتا لاؤ سدرہ کے لیے۔ کچھ کھالو تو بخار کی دوا لو۔ موسمی بخار ہے' ٹھیک ہو جائے گا" تین دن تک وہ بستر سے لگی رہنے کے بعد آج ٹی وی لاؤنج میں نظر آئی تھی۔ نیچے کا سامان اوپر کمرے میں جا رہا تھا۔ دونوں الماریاں دوبارہ اپنی جگہ پر جا رہی تھیں۔ عادل کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

"بھئی طبیعت ٹھیک کرلو' شام کو عادل کا نیا گھر دیکھنے چلنا ہے۔ وہ تو آج صبح ہی شفٹ ہوئے ہیں۔"

"اچھا" اس نے زیرِ لب کہا "مجھے تو....." وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ بھابی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔

"اس وقت تم سو رہی تھیں۔ وہ تم سے ملنے گیا تھا مگر تمہیں سوتا دیکھ کر واپس آگیا۔ سدرہ' عادل یہاں سے شفٹ بھی ہو گئے اور وہ بات رہ گئی۔" بھابی نے اسے دیکھتے ہوئے یاد دلایا۔

وہ بولی "بھابی! بات کرلوں گی۔ شفٹ ہو گئے ہیں تو کیا ہوا' اماں ابا کی خواہش ضرور پوری ہو گی۔ پھر انم آپی میں برائی کیا ہے' جو انکار کریں گے۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولتی چلی گئی۔

"تمہیں تو بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے۔ دیکھو تو رنگت کیسی پیلی ہو رہی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہارا کون سا سوٹ پریس کروں۔ رات کو کھانا عادل کے نئے گھر پر ہے اور ایک اور سرپرائز۔ عادل نے گلشن اقبال والا مکان خرید لیا ہے۔ بات کرائے کی ہوئی تھی مگر کولیگ کو اسے فروخت بھی کرنا تھا' فوراً ہی سودا طے ہو گیا اسی لیے تو عادل نے سب کو ڈنر پر بلایا ہے۔"

"مگر کھانا وغیرہ کون بنائے گا بھابی!" ماہم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ بولیں۔

"بھئی ہوٹل کس لیے ہے۔ وہیں سے لائیں گے۔"

سدرہ خاموشی سے ان لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

"میں نے تمہارے پہننے کے لیے بلیک سوٹ پریس کر دیا ہے۔" ماہم نے کہا تو وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"ماہم' کیا تمہیں پتا ہے کہ میں اداس ہوں جو تم نے حسبِ حال سوٹ بھی بلیک پریس کیا ہے۔" وہ سوچ

کر رہ گئی' بولی کچھ نہیں۔ یہ لوگ کافی رات گئے عادل کے گھر سے واپس آئے تھے۔ سدرہ چاہنے کے باوجود نہ جا سکی تھی۔ اسے شام ہی سے پھر بخار ہو گیا تھا اور وہ اماں کے ساتھ گھر پر رہی تھی۔ آج عادل کو اس کی کمی بے انتہا محسوس ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اچانک سدرہ کو ہوا کیا تھا' بات سے بات نکالنے والی سدرہ یوں خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ عادل اکیلے کمرے میں لیٹا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ سدرہ یونیورسٹی میں بھی اجنبی اجنبی سے انداز میں اس سے ملی تھی۔ نئے گھر کی بھی اس نے رسمی سے انداز میں مبارک باد دیتے ہر ئے وش کیا تھا۔ اس کے کولیگ ساتھ تھے۔ وہ اس سے کوئی بات نہ کر سکا تھا۔

دو دن سے وہ نہ تو یونیورسٹی گیا تھا اور نہ ہی سدرہ کے گھر۔ زندگی بہت بے کیف سی لگ رہی تھی۔ یہ کیسا روگ لگا تھا' محبت کا۔ دل کی بے قراری بڑھی تو وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ آج وہ سدرہ سے اس بے رخی کی وجہ ضرور معلوم کرے گا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سورج تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رخصت ہوتی دوپہر کی پیلی شعاعیں عجیب سی اداسی کا تاثر دے رہی تھیں۔ اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلا آیا۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید سب کہیں گئے ہوئے ہیں مگر دروازہ تو کھلا ہوا تھا... اتنا سناٹا۔ وہ سدرہ کے کمرے کے نزدیک آیا تو اندر سے ہلکی آواز ٹیپ کی آرہی تھی۔ وہ دروازے میں رک گیا۔ سدرہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ٹیپ پر کوئی پرانا گیت چل رہا تھا۔

میرے ساتھی تمہیں ڈھونڈتی ہے نظر
دل کو تم سے بچھڑنے کا غم ہے مگر
ایک کہانی سمجھ کر بھلا دو مجھے

وہ خاموش' ساکت کھڑا تھا۔ دروازے کے بیچ اور وہ اس کی آمد سے بے خبر بیٹھی تھی۔

ہر کہانی کو انجام ملتا نہیں
آرزو کا ہر ایک پھول کھلتا نہیں
یہ سمجھنا کہ ہم تم ملے ہی نہ تھے
پیار ہے ایک سزا یہ نہیں تھی خبر

اسی وقت لائٹ چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں پراسرار سا سناٹا چھا گیا۔ ٹیپ کے بند ہوتے ہی جیسے وہ بری طرح چونکی تھی۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا' سامنے عادل ہمدانی کھڑے تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور وہ اسے دیکھ کر چونک گئے۔ کتنی سرخ ہو رہی تھیں اس کی آنکھیں وہ ایک قدم بڑھ کر اس کے نزدیک آگئے۔

"سدرہ! یہ سب کیا ہے' تم نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے۔ سب کہاں ہیں؟"

"سب بازار گئے ہیں اور اماں ابھی تھوڑی دیر پہلے پڑوس میں گئی ہیں۔"

"اچھا ہوا' عادل ہمدانی! آپ آگئے مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی۔" اس کا لہجہ اتنا اجنبی تھا کہ ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"اگر اتنی بے وفائی کرنی تھی تو محبت کا اقرار کیوں کیا تھا۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"جی!" وہ زور سے ہنسی "آپ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ اظہار آپ نے کیا تھا' کوئی ثبوت ہے میرے اقرار کا آپ کے پاس۔ عادل ہمدانی! آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو کبھی اس انداز سے آپ کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ عجیب کھیل ہے محبت کا' جس سے محبت کی جائے وہ دور ہوتا جاتا ہے۔ آپ کا اور میرا درد مشترک ہے۔ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ میرے دل میں تو پہلے ہی کوئی آباد ہے مگر اچانک میری محبت کے گلشن میں خزاں کے بادل چھاگئے ہیں۔ کسی کو ہم نہ ملے اور کوئی ہمیں نہ ملا۔ اس نے آہستہ سے کہا تو عادل ہمدانی نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"سدرہ' میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"

"یہی تو المیہ ہے۔ اکثر ہم اپنے سامنے والے کو سمجھنے میں غلطی کرجاتے ہیں۔ میں نے بھی بالکل ایسی ہی غلطی اسے سمجھنے میں کی اور وہ مجھے دغا دے گیا اور آپ نے دیکھا' اس کی بے وفائی کے غم میں' میں کیسی بکھر گئی ہوں۔ آپ کو پتا ہے' آپ کو کوئی بہت چاہتا ہے۔ کسی کا دل آپ کو پہلی بار ہی دیکھ کر دھڑکا تھا۔ تو جو آپ کو چاہتا ہے' آپ اسی کی فکر کریں۔ سراب کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں ایک سراب ہی تو ہوں کیونکہ میں اسے بھلا نہیں سکتی۔ انم' آپ سے محبت کرنے لگی ہیں مگر محبت کا یہی تو المیہ ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتا۔ پتا نہیں کیوں محبت میں جدائیاں ہی حصے میں آتی ہیں۔"

"کیا کہا آپ نے' انم مجھے..... انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے بے یقینی سے سدرہ کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"ہاں' یہی حقیقت ہے۔ کل جب میں نے انہیں اپنا قصۂ غم بتایا تو وہ بھی اپنے دل کا راز کھول بیٹھیں کہ وہ کیسے چپکے چپکے خیالوں میں آپ سے محوِ گفتگو ہوتی ہیں۔ کتنے خواب سجائے ہیں انہوں نے آپ کے نام کے ساتھ۔ اپنی آنکھوں میں" اس نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"عادل ہمدانی' اگر واقعی آپ کو مجھ سے سچی محبت ہے۔ تو پھر تھام لیجئے انم آپی کا ہاتھ' اس نے بہت عاجزی سے ان سے وہ کچھ مانگا تھا جو دینا اتنا آسان نہیں تھا۔

اسی وقت اماں گھر میں داخل ہوئیں۔ "ارے عادل! تم کب آئے۔" انہوں نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

"السلام علیکم آنٹی! بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔"

پھر وہ بولیں "دیکھ بیٹا عادل! سدرہ کی تو طبیعت ہی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے' روز رات کو بخار تیز ہو جاتا ہے۔ دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں گئی ہے۔"

"کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں" وہ کہتے ہوئے رشیدہ بانو کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئے۔

"بیٹھو بیٹا' میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ انہوں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا تو وہ بولے۔

"نہیں آنٹی۔ اس وقت مجھے چائے کی بالکل طلب نہیں ہے۔ یہ بھابی نظر نہیں آرہی ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"بیٹا' کچھ شاپنگ رہ گئی تھی' بازار گئی ہیں تینوں' آتی ہی ہوں گی اور تم بتاؤ' جمیلہ بہن وغیرہ کب تک آرہی ہیں؟"

"بس دو تین دن میں یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔ امی' پاپا اور سجاد بھائی آئیں گے۔ ظفر بھائی اور بھابی وغیرہ تو فیصل آباد ہی میں رہیں گے کیونکہ ان کی جاب ہی ادھر ہے۔ امی تو میری اور سجاد بھائی کی وجہ سے یہاں شفٹ ہو رہی ہیں کیونکہ دو تین مہینے میں سجاد بھائی کا ٹرانسفر بھی این ای ڈی میں ہو جائے گا۔ بس گورنمنٹ ایجوکیشن جاب میں یہی ہے کہ جہاں بھی ٹرانسفر ہو' جانا پڑتا ہے۔ پاپا کے لیے مسئلہ ہے کہ اب ان کا بزنس فیصل آباد میں جم گیا ہے۔ آئل کا ہول سیل کا بزنس جما ہوا ہے۔ پاپا تو عید کی وجہ سے امی کے ساتھ آرہے ہیں۔ عید بعد واپس چلے جائیں گے' ظفر بھائی کے پاس۔"

"تو بیٹا' کیا تم سے بڑے سجاد کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔" رشیدہ بانو نے پوچھا تو وہ بولے۔

"نہیں آنٹی' شادی انیلہ باجی کی شادی کے بعد ظفر بھائی اور سہیل بھائی کی ہوئی تھی۔ سہیل بھائی تو اپنے بچوں کے ساتھ کینیڈا چلے گئے تھے۔ آج کل امی سجاد کے لیے لڑکیاں تلاش کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں سجاد کی شادی کر کے وہ واپس فیصل آباد چلی جائیں گی۔ یہاں وہ خاص کر اسی سلسلے میں آرہی ہیں کہ یہیں کی لڑکی دیکھیں گی تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔"

"اور تمہارا کیا ارادہ نہیں ہے' شادی کا؟" آج انہیں کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں آنٹی' ابھی میں نے شادی کے بارے میں کوئی ارادہ نہیں کیا ہے۔" انہوں نے بہت آہستہ سے سپاٹ سے لہجے میں کہا تو رشیدہ بانو بولیں۔

"اے بیٹا' ابھی شادی نہیں کرو گے تو کب کرو گے۔ جمیلہ بہن آئیں تو میں تو کہوں گی تم دونوں کا گھر بسا دیں۔"

ان کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی وقت ماہم' انم وغیرہ آگئیں۔

"اوہو' آج تو عادل بھائی آئے ہوئے ہیں۔" ماہم انہیں دیکھتے ہی چہکی۔

"بھئی عادل! تم تو عید کا چاند بنتے جا رہے ہو۔" بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کتنے دن بعد خبر لی ہے تم نے۔" وقار بھی پوچھ رہے تھے۔

"بس بھابی! وقت نہیں ملا۔ آج کل گھر کو ڈیکوریٹ کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ گھر لینا اور پھر اسے ڈیکوریٹ کرنا بھی ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔"

"ارے عادل' اگر گھر کو اچھی طرح خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کرنا ہے تو ہماری انم کو لے جاؤ' گھر کو سجانے کا بڑا طریقہ آتا ہے۔" انم سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہولے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"عادل! بھابی تو بس کچھ زیادہ ہی میری تعریفوں کے پل باندھتی رہتی ہیں۔"

"لو' میں تو حقیقت بتا رہی ہوں۔ میرے جیسی بھابی چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گی تو نہ ملے گی۔ ورنہ بھابیاں تو نندوں کی خامیاں گنوانے میں لگی رہتی ہیں۔ ایک ہماری بھاوج ہیں' کبھی جو جھوٹے بھی ہماری کسی خوبی کی تعریف کی ہو۔" دل نے کہا۔

"ہاں بھئی' ہے کوئی ہماری بھابی سا جو سامنے آئے۔" ماہم نے بھابی کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے لاڈ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سے کہا تو اماں مسکرانے لگیں۔
"واقعی' دلہن بیگم تو بے مثال ہیں۔"
"اماں' اتنی تعریف نہ کیجئے' بھابی خوشی سے موٹی ہو جائیں گی اور وقار بھائی کو موٹی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔"
"اماں' سدرہ کدھر ہے؟" انم کو ایک دم سدرہ کی کمی محسوس ہوئی تو وہ پوچھ بیٹھی۔
"بیٹا' وہ تو تمہیں پتا ہے جب سے طبیعت خراب ہوئی ہے' کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر ہے۔"
انم فوراً ہی اس کے کمرے کی طرف جاتی ہوئی بولی "ابھی لاتی ہوں بلا کر۔ ماہم تم چائے بناؤ۔"
انم سدرہ کو لیے اماں کے کمرے میں آئی تو عادل جا چکے تھے۔ "ارے اماں' عادل کہاں چلے گئے؟ چائے بن رہی تھی" انم نے پوچھا تو بھابی بولیں۔
"انہیں گھر پہنچنا تھا۔ چھ بجے ان کی امی کا فون آنے والا ہے۔"
"بیٹا سدرہ' تم نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔ چائے یا دودھ سے سلائس لے لو۔"
"نہیں اماں' میرا جی نہیں چاہ رہا۔ جب بھوک لگے گی تو کھا لوں گی۔" وہ اماں کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔
عادل کئی دن سے بہت الجھے ہوئے تھے۔ انہیں سدرہ کی کہی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا جو کچھ اس نے ان سے کہا ہے' سب جھوٹ ہے۔ جھوٹی کہانی ہے' نہ جانے کیوں وہ ان کی محبت سے دامن بچا رہی ہے۔
کچھ سوچ کر انہوں نے بھابی سے بات کرنے کا ارادہ کیا' دوسرے لمحے وہ بیٹھے سدرہ کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہے تھے۔ "ہیلو" دوسری طرف فون بھابی نے ہی اٹھایا تھا۔
"السلام علیکم' بھابی!"
"ہاں عادل' کیسے ہو؟ کہاں غائب رہتے ہو' پورا ہفتہ گزر گیا۔ تم تو پھر پلٹے ہی نہیں" بھابی نے گلہ کیا۔
"بس بھابی' آج کل میں بہت الجھا ہوا ہوں" عادل نے کہا تو وہ بولیں۔
"کیوں بھئی' خیریت... مجھے بتاؤ' کیا پرابلم ہے' ہمیں کیا غیر سمجھتے ہو؟"
"نہیں بھابی! ایسی بات نہیں ہے' آپ لوگوں کے خلوص کا تو میں دل سے ممنون ہوں اور سب کیا کر رہے ہیں؟"
"اماں اپنے کمرے میں عصر کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ وہ تینوں بازار گئی ہیں۔ ماہم کو کچھ لینا تھا۔ میرے خیال میں عید کے لیے چوڑیاں وغیرہ۔"
"سدرہ کی طبیعت کیسی ہے؟" اب عادل نے پوچھا۔
"کیوں' کیا تمہاری ملاقات یونیورسٹی میں نہیں ہوتی۔ اب تو ٹھیک ہے اور یونیورسٹی بھی جا رہی ہے۔"
بھابی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

"ہیلو عادل' کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئے' کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔"
"نہیں بھابی! ایسی بات نہیں ہے" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولیں۔
"چکر کیا ہے' بڑی ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو؟"
"وہ بھابی انم..." ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بھابی بولیں۔
"اچھا تو یہ بات ہے۔ کیا سدرہ نے تم سے ذکر کیا تھا کہ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ تم انم سے شادی کر لو؟"
"کیا انم بھی یہی چاہتی ہیں؟" عادل نے ایک دم پوچھا۔
"نہیں عادل! اس کا تو مجھے نہیں پتا کہ وہ چاہتی ہے کہ نہیں مگر اماں اور ابا کی یہ خواہش ہے کہ تمہارا رشتہ انم سے ہو جائے انم بہت سلجھی ہوئی پیاری لڑکی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہی سوچ کر میں نے سدرہ سے ذکر کیا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ان دنوں یونیورسٹی آتی جاتی تھی تو آسانی سے تم سے بات کر لے گی۔"
"او آئی سی۔" عادل نے ایک دم کہا تو وہ چونکیں "کیا ہوا۔ بھئی تم نے پھر ٹھنڈی آہ بھر ڈالی؟"
بھابی ہنستے ہوئے بولیں تو انہوں نے سب کچھ تفصیل سے بھابی کو بتا دیا کہ وہ سدرہ کو پسند کرتے ہیں اور سدرہ بھی۔" مگر اس نے بہن کی خاطر ان سے بے وفائی کا ڈراما کھیلا ہے۔ اپنے دامن کی خوشیاں بہن کے دامن میں ڈالنے کے لیے وہ کتنے کرب سے گزر رہی ہے۔
"او نو عادل! میں تو بالکل بھی نہیں سمجھ سکی کہ سدرہ اور تم.... مگر کچھ دنوں سے سدرہ کی بیماری اور اس کی حالت دیکھ کر میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر بات کیا ہے کہ اچانک سدرہ کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ عادل! تم فکر نہ کرو' میں سدرہ سے بھی بات کروں گی اور مناسب موقع پر اماں سے بھی۔ ابھی تم خاموش رہو' جب تک تمہاری فیملی یہاں شفٹ نہیں ہو جاتی' ویسے ایک بات ہے اگر تم انم کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہارے اور سدرہ کے راستے میں کسی دیوار کا حائل ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ اصل میں سدرہ سب سے چھوٹی ہے اور انم بہنوں میں سب سے بڑی بہن ہے۔ اماں اپنی جگہ درست ہیں کہ انہوں نے تمہارے لیے' انم کے لیے سوچا۔"
"او کے بھابی!" انہوں نے خوش دلی سے ریسیور رکھتے ہوئے کہا "تو سدرہ! میرا خیال درست نکلا۔ بے وفائی کا ڈھونگ کر رہی تھی۔ تم اپنے آپ کو اذیت دے رہی تھیں۔"
عادل کے گھر والے کراچی آ چکے تھے۔ عید کرنے۔ کراچی ان لوگوں کے ساتھ ظفر بھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آ گئے تھے۔ جمیلہ عادل کے ساتھ رشیدہ بانو سے جا کر مل آئیں۔ ایک آدھ گھنٹے کے لیے گئی تھیں اور اتنی ہی دیر میں دونوں نے ڈھیر ساری باتیں کر ڈالی تھیں کہ اتنی تفصیلی گفتگو تو کبھی اس وقت بھی ان دونوں کے درمیان نہیں ہوئی تھی... جب یہ دونوں ایک دوسرے کی قریبی پڑوسن تھیں۔ بس کبھی تقریبات میں یا کہیں ملاقات ہو گئی تو دعا سلام ہو جاتی تھی اور اب جب دس بارہ سال بعد ملاقات ہوئی تو یوں لگا کہ جیسے دونوں گھرانوں میں بہت پرانے گہرے تعلقات ہیں۔ اتفاق ہی تھا کہ جمیلہ کو سجاد کے لیے انم پسند آ گئی تھی۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے عادل سے سرگوشی میں کہا تھا۔ "عادل! تمہارا کیا خیال ہے انم کے بارے میں؟" وہ ایک دم

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گڑبڑا گئے مگر ان کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی۔ "میں سجاد کے لیے پوچھ رہی ہوں۔" عادل ایک دم ہی بولے۔

"زبردست' ابھی بات کرلیجئے۔"

وہ ایک دم بولیں "تمہارے ابا سے تو مشورہ کرلوں" وہ وہاں سے آئے تو بہت مسرور تھے۔ راستے کے تمام کانٹے خود ہی صاف ہوگئے تھے۔ سدرہ کا رویہ اس دن بھی ان کے ساتھ ویسا ہی اجنبی سا تھا۔ عادل نے خود بھی جان بوجھ کر اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عادل کے پاپا بھی اپنی بیگم کی خواہش پر بہت خوش تھے کہ سجاد کے لیے جان پہچان میں لڑکی پسند آگئی تھی۔ اسی شام جمیلہ عادل کو لے کر صرافہ بازار چلی گئی۔ انہیں انم کے لیے انگوٹھی لینی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ عید کے دن وہ انگوٹھی پہنا کر انم کو سجاد سے منسوب کردیں۔ رشیدہ بانو نے پہلے دن ہی ملاقات پر کہہ دیا تھا کہ عید کا کھانا آپ سب لوگ ہمارے گھر کھائیں گے اور جمیلہ ان کی پرخلوص دعوت کو قبول کرچکی تھیں اور اس سے مناسب موقع انہیں کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا کہ سب اکٹھا بھی ہوں گے اور بات بھی ہوجائے گی۔

انہوں نے ایک خوبصورت انگوٹھی پسند کرکے پیک کرالی تو عادل نے ایک اور فیروزی نگینے کی انگوٹھی اٹھاتے ہوئے کہا "امی! انگوٹھی کیسی ہے؟" انہوں نے پلٹ کر انگوٹھی دیکھی۔

"بہت خوبصورت ہے۔"

وہ بولے "امی' اسے بھی پیک کرالیجئے۔"

"بیٹا! بس ایک انگوٹھی چاہیے" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں تو وہ ماں کی طرف جھک کر سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ "امی' ایک بہو آپ نے پسند کرلی اور ایک بہو میں نے آپ کے لیے پسند کی ہے۔"

"کیا مطلب ہے عادل! یہاں بازار میں کھڑے ہوکر پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"امی' سرپرائز تو اسی طرح اچانک دیا جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے امی! انم کی چھوٹی بہن سدرہ میرے لیے کیسی رہے گی؟"

"شریر! تم تو چھپے رستم نکلے۔ اپنی اماں کو پہلے ہی نہیں بتا سکتے تھے۔ چلو جی' ان کے گھر ٹھہرنے کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مجھے ایک ساتھ دو بہوئیں مل گئیں' ماشاءاللہ سے دونوں ہی اچھی ہیں۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وقار اور فرید احمد ابھی عید کی نماز پڑھ کر آئے تھے کہ رشیدہ بانو نے کہا۔

"اجی سنتے ہو' عادل کی امی کا ابھی ابھی فون آیا تھا۔ عید کی مبارک باد دیتے ہوئے کہہ رہی تھیں' آپ کی دعوت پر شام کو ہم لوگ آرہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ منگنی کی انگوٹھی پہنانے بھی آرہے ہیں۔ ماشاءاللہ سے آپ کی بچیاں مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ میں کوئی جواب دے ہی نہیں سکی کہ لائن کٹ گئی۔"

رشیدہ بانو خوشی سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ سدرہ نے تیزی سے ہونٹ کاٹ ڈالے۔ "عادل! تم نے میرا مان رکھ لیا۔ میری بات مان لی۔ کیا ہوا اگر تم مجھے بے وفا سمجھتے ہو یا یہ سمجھتے ہو کہ میں کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ اچھا ہے اس طرح تم مجھ سے دور ہوجاؤ گے اور آپی کو خوش تو رکھ سکو گے" وہ سوچتی ہوئی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

بھابی کی نظر اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت پر پڑی تو بولیں "سدرہ' شام کو کون سا جوڑا پہن رہی ہو۔ آخر کو انم کو وہ لوگ انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔ ویسے بھی آج عید ہے۔ ذرا اچھی طرح تیار ہونا۔"

بھابی کو فون کرکے عادل نے سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا جبھی بھابی خوب چہک رہی تھیں۔ بھابی ہنستی ہوئی کمرے کی طرف جا رہی تھیں کہ انہیں ایک دم چکر آگیا اور وہ گر کر بے ہوش ہوگئیں۔ سب ایک دم پریشان ہوگئے۔ فوری طور پر انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ رشیدہ بانو' وقار وغیرہ بری طرح پریشان تھے۔ اسی وقت ان کے ٹیسٹ وغیرہ ہوئے۔ لیڈی ڈاکٹر رشیدہ بانو کے قریب ہوتے ہوئے بولی "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی ہے' آپ کی بہو ماں بننے والی ہیں۔" رشیدہ بانو کے تو اسی وقت ہاتھ اٹھ گئے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے۔ جب وہ نوازنے پر آتا ہے تو کچھ دینے میں دیر نہیں لگتی۔

اماں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ پورے پانچ سال بعد وقار کے یہاں بچے کی آمد کا سن کر ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

دلہن بیگم کو تاکید کردی گئی تھی کہ وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔ انم اور ماہم وغیرہ کچن میں شام کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھیں۔

مغرب بعد جمیلہ خاتون اپنی فیملی کے ساتھ آگئی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے تھے۔ انم اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ بھابی ادھر ہی آگئیں۔ "ارے سدرہ! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" انہوں نے اسے یونہی سادہ سے گلابی سوٹ میں دیکھا تو ٹوک دیا۔

"بھابی' ٹھیک تو ہوں۔ انم آپی کو ٹھیک طرح تیار ہونا چاہیے۔"

"مگر محترمہ! تم بھی اچھی طرح تیار ہوجاؤ' آج تمہارے لیے بھی زبردست سرپرائز ہے۔ جلدی اٹھو' فٹافٹ۔ تم دونوں ٹھیک طرح تیار ہوکر نیچے آؤ' میں ماہم کو بھیج رہی ہوں۔ ابھی تک تم دونوں سلام کرنے بھی نہیں آئیں۔ آدھا گھنٹا ہوگیا ہے' ان لوگوں کو آئے ہوئے" بھابی کہہ کر نیچے اتر گئیں۔

انم بولی "سدرہ! کیسا سرپرائز ہے۔ ہمیں بھی تو کچھ پتا چلے؟"

"مجھے کیا پتا انم آپی! یہ تو آپ کو بھابی سے پوچھنا چاہیے تھا۔"

انم اور سدرہ دونوں ہی ڈرائنگ روم میں ایک ساتھ داخل ہوئیں۔ "السلام علیکم! عید مبارک" انم اور سدرہ نے ایک ساتھ کہا۔ جمیلہ خاتون نے اٹھ کر دونوں کو گلے سے لگا کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"فرید بھائی اور آپا رشیدہ! آپ کی اجازت سے میں انم کو سجاد کے نام کی انگوٹھی پہنا رہی ہوں۔ میرے بیٹے ماشاءاللہ سے اتنے ہونہار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں کہ آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ شاید اسی لیے آپ لوگوں کی مرضی معلوم کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے" انہوں نے انم کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنا دی۔

سجاد سامنے ہی بیٹھے ماں کے انتخاب کی داد دل ہی دل میں دے رہے تھے۔ انہوں نے آج پہلی بار انم کو دیکھا تھا۔

لائٹ گرین سوٹ میں ہلکے سے میک اپ میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ سدرہ کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی "تو عادل' تم نے میرا مان توڑ دیا۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو کم از کم میری بات ہی رکھ لیتے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مگر تم نے تو..." وہ نیچی نظر کیے سوچے جا رہی تھی۔ بھابی سامنے ہی بیٹھی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں۔

جبھی' جیسے اس کے کانوں میں جلترنگ بج اٹھے۔ جمیلہ خاتون نے دوسری ڈبیا کھول کر فیروزی نگینے کی انگوٹھی نکالی۔ رشیدہ بانو حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے برابر بیٹھی سدرہ کا ہاتھ تھاما اور انگوٹھی اس کے خوبصورت ہاتھ کی انگلی میں جگمگانے لگی۔

"آپا رشیدہ! سدرہ کو میں نے اپنے عادل کے لیے منتخب کرلیا ہے جبکہ یہ چھپا رستم تو پہلے ہی سدرہ کو منتخب کیے بیٹھا تھا۔" انہوں نے کہا تو اماں' ابا' وقار سب ہی کھل اٹھے تھے کہ وہ تو انعم کے لیے پریشان تھے مگر اللہ نے دونوں بیٹیوں کے لیے اتنے لائق فائق لڑکوں کا جوڑ بھیج دیا تھا۔ وہ اس پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کرتے' کم تھا۔

سدرہ سے وہاں بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ سب کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی آنکھوں میں پھیلا کاجل صاف کر رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ پر تیزی سے مڑی تو عادل اس کے روبرو کھڑے تھے۔ انہوں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی "عید مبارک۔ اور عرض ہے۔"

محبت دائمی ہے
نہ چھپ سکتی ہے
نہ دب سکتی ہے
چھپاؤ گے اسے تم تو یہ
اظہار سے اپنے تمہیں
حیران کردے گی۔

"جی ہاں حیران تو آپ نے سب ہی کو کردیا ہے۔ بہت ہوچکا اظہار' چلیے کھانے پر' سب بلا رہے ہیں۔" ماہم نے اچانک ہی آکر انہیں چونکا دیا۔

"تمہیں کباب میں ہڈی بننے کا بہت شوق ہے ماہم! تم فوراً ہی نازل ہوگئیں۔"

"ارے' ماہم میری بڑی بہن ہے' ہڈی تو نہ بنائیں" سدرہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو عادل دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولے۔

"آئندہ غلطی نہیں ہوگی۔ معافی چاہتا ہوں" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں اس کی چاہت کے دیپ روشن تھے۔ اس کے موسم درد پر بڑی اچانک موسم گل نے دستک دی تھی۔ وہ ان کے ساتھ مسرور سے انداز میں نیچے اتر رہی تھی کہ اب یہ قدم ساتھ ساتھ چلنا ہے۔

○☆○

بھرم

وہ گرمیوں کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ بچے اسکولوں کی اور بڑے آفس اور اپنے کاروباری جگہوں پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اچانک شہر کے متوسط علاقے کے ایک محلے سے لوگوں کا شور بلند ہوا۔ اس محلے کی ایک تین منزلہ بلڈنگ کو آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ زخمی مکینوں کی چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ایمبولینس جائے حادثہ پر پہنچ گئی تھی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں اور آگ پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ انتظامیہ حرکت میں آچکی تھی۔ پولیس اور رینجرز کی گاڑیوں نے متاثرہ علاقے کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ حادثے کی جگہ پر جمع ہونے والا لوگوں کا ہجوم منتشر ہونے لگا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جام ہوگیا تھا۔

اپنی بالکونی میں وہیل چیئر پر بیٹھا بوڑھا شاکر الدین اس خوفناک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ کرب نمایاں تھا۔ آنکھیں بے خوابی کی چغلی کھا رہی تھیں۔ اس کی بالکونی اسی تین منزلہ بلڈنگ کے سامنے تھی۔ وہ ایک ٹک اس جلتی ہوئی بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا۔ اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں کئی دکانیں تھیں۔ تیسری منزل کے دوسرے حصے میں فخر زماں رہتے تھے۔ شاکر الدین کے ان کے ساتھ بہت پرانے تعلقات تھے۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ شاکر الدین پیروں سے معذور بے بسی سے دوست کا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ وہ روزانہ صبح سویرے اس بالکونی میں بیٹھ کر ہوا لیتا تھا مگر آج وہ دو دن بعد اس بالکونی میں آیا تھا۔

دو دن سے وہ ایک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ ایک ٹک ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہوا کیا ہے؟ اس نے تو بس ایک زبردست دھماکے کی آواز سنی تھی اور اس کے بعد ہی بلڈنگ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں شعلے بلند ہوگئے تھے۔ اس کی چھوٹی بیٹی سائرہ گھبرائی ہوئی بالکونی میں آئی اور بولی۔

"بابا! آپ نے کچھ سنا' معراج طیارے نے ایندھن کی ٹنکی گرائی ہے۔"

بوڑھے شاکرالدین نے کھوئی کھوئی ہوئی آنکھوں سے سائرہ کی طرف دیکھا اور کہا "دھماکا تو میں نے بھی سنا تھا سائرہ بیٹی! فخرزماں کا گھر تباہ ہوگیا ہے۔ وہ دیکھو! لاشیں نکالی جارہی ہیں۔"

لاشوں کو دیکھتے ہی شاکرالدین کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ لاشوں کی صورت میں جلے ہوئے ڈھانچے تھے۔ اچانک اس کے کرب ناک چہرے پر اطمینان کی پرچھائیاں نمودار ہوگئیں جیسے اسے کوئی تسکین مل گئی ہو۔ سائرہ قریب کھڑی باپ کی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔

"بابا! کئی گھر تباہ ہوگئے۔ کوئی نہیں بچا..... فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آگ پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کررہی ہیں۔ آگ دیکھیں' پھیلتی جارہی ہے۔ پوری بلڈنگ تباہ ہوگئی ہے۔" سائرہ کی آواز بھرا گئی۔

"کیا ہوگیا ہے بابا آپ کو آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟ یہ رونے کا مقام ہے۔ اندر چلیں! مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"سائرہ بیٹی! تم نہیں سمجھو گی۔ تمہارا بابا اس وقت کتنا بے بس ہے۔ میری کیفیت کو تم کیا سمجھو گی؟ جب ڈوبتے کو کنارا مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ہوتی ہے' جو میری ہے۔" شاکرالدین نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"بابا! آپ بس اندر چلیں۔ پتا نہیں' کیسی باتیں کررہے ہیں۔ اس حادثے نے آپ کے ذہن کو مفلوج کردیا ہے۔ پہلے ہی آپ غم سے نڈھال ہیں۔"

"کاش! مائرہ آپی! آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" سائرہ سوچتی ہوئی شاکرالدین کی وہیل چیئر کو لیے ان کے کمرے میں آگئی "امی! بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ عجیب قسم کی باتیں کررہے ہیں۔" ماں نے شاکرالدین کی طرف دیکھا۔

"ہاں سائرہ! ہم تو پہلے ہی غم سے بے حال ہیں۔ فخرزماں کے گھر کی تباہی نے تمہارے باپ کو اور بھی ہراساں کردیا ہے۔ کیسا ایک پل میں سب کچھ راکھ ہو کر رہ گیا۔ پوری بلڈنگ میں آٹھ گھر آباد تھے۔ سب ہی تباہ ہوگئے۔"

شاکرالدین نے خالی خالی نظروں سے حمیدہ کی طرف دیکھا اور بولا "حمیدہ! مائرہ کہاں ہے؟"

حمیدہ نے عجیب نظروں سے شاکرالدین کی طرف دیکھا۔ اب اسے شک ہوچلا تھا کہ شاکرالدین کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے "شاکرالدین! میں تمہیں دوا دیتی ہوں۔ کھا کر آرام کرلو۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔" حمیدہ نے شاکرالدین کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں آؤ! میرے قریب۔" شاکرالدین نے حمیدہ کو قریب بلاتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔

حمیدہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموشی سے ان کی وہیل چیئر کے پاس آکر بیٹھ گئی "کیا ہوگیا ہے تمہیں شاکرالدین؟ تم کیوں بہکی بہکی باتیں کررہے ہو؟" حمیدہ نے دبے دبے لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

"حمیدہ! میری بات غور سے سنو۔"

پھر سرگوشی کے سے انداز میں حمیدہ سے کچھ کہنے لگا۔ مائرہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔ شاکرالدین کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ اس کی ماں سے کیا کہہ رہا تھا' اس کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آسکا تھا۔ ابھی وہ غور کررہی تھی کہ آخر بات کیا ہے کہ ماں کی ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی۔ وہ بری طرح لرز کر رہ گئی۔

"ہائے میری بچی مائرہ!" ماں اپنا سینہ بری طرح پیٹ رہی تھی۔ شاکرالدین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کے گھر سے چیخ کی اور رونے کی آواز سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ گھر میں آگئے تھے۔

حمیدہ زار و قطار رو رہی تھی "ہائے! کوئی میری بچی کو بچاؤ! وہ فخرزماں کے گھر گئی تھی۔ وہ تو روزانہ ہی شاہانہ کے ساتھ جاب پر جاتی تھی۔ ہائے! مجھے کیا خبر تھی' میں آج نہ بھیجتی۔"

لوگ شاکرالدین کو تسلیاں دے رہے تھے "شاکرالدین صبر کرو۔ دیکھو' بے چارے فخرزماں کا تو پورا گھر تباہ ہوگیا ہے۔ راکھ کا ڈھیر بن گیا ہے۔ ایک بیٹا ملک سے باہر ہے۔ اس پر اس حادثے کا کیا ردعمل ہوگا؟" ایک خاتون نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

سامنے بت بنی سائرہ خالی خالی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

"ارے! لگتا ہے' اسے سکتہ ہوگیا ہے۔" ایک خاتون نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ سرخ سرخ آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ وہ تو اپنے باپ کی بے بسی پر کرب سے بے حال تھی۔ اس کے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ بگولے اٹھ رہے تھے۔

جلے ہوئے ملبے میں سے لاشوں کے ٹکڑے جمع کیے جارہے تھے جو کوئلہ ہوگئے تھے۔ جن کی شناخت کرنا مشکل تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شاکرالدین کا گھر پرسہ دینے والوں سے بھرنے لگا۔ عزیز' رشتے دار' دوست' احباب سبھی چلے آرہے تھے۔

○☆○

دوسرے کمرے میں بیٹھی خواتین سیپارے پڑھ رہی تھیں۔

شام گہری ہوچلی تھی۔ پورے گھر میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آج مائرہ کا سوئم تھا۔ سائرہ ایک جگہ خاموش بیٹھی تھی۔ اسے سب نے رلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ شاید تمام آنسو اپنے اندر جذب کرچکی تھی۔ شاکرالدین اور حمیدہ بھی خاموش تھے۔

طوفان گزر گیا تھا۔ لاشیں دفنائی جاچکی تھیں۔ حمیدہ نے بھی ایک جلے ہوئے ہاتھ کی شناخت کرکے اسے مائرہ کے نام سے دفن کرادیا تھا۔ قبرستان میں اس کے نام کی پکی قبر بنوادی تھی۔

عزیز رشتے دار آہستہ آہستہ رخصت ہوگئے تھے۔ گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ سائرہ کمرے کے کونے میں بیٹھی ایک ٹک باپ کو دیکھ رہی تھی۔ سائرہ کی آنکھوں کے سامنے منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔

شاکرالدین اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ بہت پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دو بیٹیاں دی تھیں۔ بڑی مائرہ اور اس سے دو سال چھوٹی سائرہ! شاکرالدین ایک گورنمنٹ ادارے میں کلرک تھا مگر طریقے سلیقے سے گزر بسر اچھی خاصی ہورہی تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ مائرہ نے اچھی پوزیشن میں بی اے کیا تھا۔ سائرہ ابھی سیکنڈ ایر میں تھی۔ شاکر الدین کی توجہ کا مرکز یہ دونوں لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو بھرپور خوشیاں دینا چاہتا تھا مگر شاکر الدین ان دنوں بیمار رہنے لگا تھا۔ اس شام وہ چاروں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے کہ مائرہ نے کہا۔

"بابا! آپ بہت تھک جاتے ہیں۔ مجھے ایک فرم میں بہت اچھی جاب مل رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔" مائرہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ شاکر الدین بولے "بیٹا! ابھی میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ تم دونوں کا بوجھ نہ اٹھا سکوں۔ ایسا کبھی نہ سوچنا۔ یہ الگ بات کہ میں تمہیں بیٹی نہیں' بیٹا سمجھتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سے جاب کرواؤں۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اگر میں ریٹائر ہو بھی گیا تو جو فنڈ کی رقم ملے گی' اس سے کوئی چھوٹا سا کاروبار کرلوں گا۔ دال روٹی چلتی رہے گی پھر تم دونوں اپنے اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔ ہم دونوں کا کیا ہے' زندگی کی گاڑی یونہی چلتی رہے گی۔" شاکر الدین نے اپنی بیوی حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

مائرہ خاموش ہو گئی مگر اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جاب ضرور کرے گی۔ ایسے سنہری موقعے خوش قسمت لوگوں ہی کو ملتے ہیں ورنہ لوگ تو اس دور میں جاب کے لیے سڑکیں ناپتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ "نو ویکنسی!" کا بورڈ ان کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے مگر مجھے تو گھر بیٹھے اتنی اچھی آفر ہوئی ہے۔ شاہانہ نے بتایا تھا کہ اس کے ایم ڈی کے دوست نبیل صاحب کو اپنے ادارے کے لیے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ شرط صرف اتنی سی تھی کہ لڑکیاں خوب صورت ہوں اور میں شکل میں تو کسی سے کم نہیں ہوں۔

"کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟ ابھی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شاکر الدین نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تو وہ اپنی سوچوں سے چونک گئی۔ ایک نظر ماں کی طرف دیکھا۔ بولی کچھ نہیں اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

زندگی رواں دواں تھی۔ مائرہ نے باپ کو کسی طرح قائل کرکے جاب کرلی تھی مگر اس نے گھر میں اپنی جاب کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ شاہانہ کی فرم میں ٹائپسٹ کی سیٹ پر ہے جبکہ وہ ایک اشتہاری کمپنی میں نبیل ہمدانی کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی۔ صبح میں وہ شاہانہ کے ساتھ ہی جاتی تھی۔ واپسی پر نبیل ہمدانی کا ڈرائیور اسے چھوڑ دیتا تھا کیونکہ شاہانہ اور مائرہ کی واپسی کے اوقات الگ الگ تھے۔ شاہانہ پانچ بجے فارغ ہو جاتی تھی جبکہ مائرہ کا وقت سات بجے تک تھا۔ اکثر اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی۔ ماں نے اکثر دیر سے آنے پر اسے ٹوکا تھا مگر ہر بار وہ کوئی معقول بہانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

ان دنوں مائرہ کی شادی کا ذکر گھر میں چل رہا تھا۔ شاکر الدین کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا ابوظہبی میں ایک میڈیسن کمپنی میں ملازم تھا۔ تعلیم یافتہ گھرانا تھا۔ شاکر الدین' اپنے دوست جہانگیر حسن کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ چھوٹی سی فیملی تھی۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹے کے لیے انہوں نے مائرہ کے لیے بات کی تھی۔ ان کی فیملی کے یہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ مائرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے صاف انکار کردیا۔

"نہیں امی! ابھی شادی کا سلسلہ نہیں چلائیں۔"

"ارے! کیسی فضول ضد ہے؟ اچھا بھلا رشتہ ہے۔ کیا برائی ہے؟" ماں نے کریدا "انکار کرنے کی کوئی وجہ؟"

"امی پلیز! پریشان نہ ہوں۔ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ چند سال رک جائیں پھر آپ جہاں کہیں گی' وہیں شادی کرلوں گی۔"

"یوں کیوں نہیں کہتیں کہ تم چند سال کے لیے شادی کو ٹالنا چاہ رہی ہو مگر میں پوچھتی ہوں' کس کے لیے؟" اماں کا لہجہ ترش تھا۔

"کسی کے لیے نہیں اس گھر کی بھلائی کے لیے۔ حالات کچھ بہتر ہو جائیں تو اس سے اچھے رشتے مل جائیں گے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور اسی رات شاکر الدین پر اچانک فالج کا اثر ہو گیا۔ دونوں بیٹیاں اور ماں انہیں لے کر اسپتال پہنچے۔ شاکر الدین ایک مہینہ اسپتال میں داخل رہے۔ فالج کا اثر دونوں ٹانگوں پر ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے تھے۔ پرائیویٹ اسپتال کے تمام اخراجات نبیل ہمدانی نے اٹھائے تھے۔ مائرہ تو ان کی بے انتہا مشکور تھی کہ اگر وہ اس برے وقت میں ساتھ نہ دیتے تو وہ کیا کرتی؟ نبیل ہمدانی جیسا فرشتہ صفت انسان کوئی کوئی ہوتا ہے۔ وہ عمر میں اس کے باپ کے برابر تھے۔ اس کا خیال بھی بہت رکھتے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے اعتماد میں جکڑا ہوا تھا۔

شاکر الدین اسپتال سے گھر آ گئے تھے۔ علاج جاری تھا۔ کچھ دن بڑی خاموشی سے گزر گئے۔ ایک شام ماں نے پھر بات چھیڑی۔

"مائرہ! جہانگیر صاحب اور ان کی بیگم دو دفعہ آ چکی ہیں۔ منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی ہیں اور شادی بھی تین مہینے کے اندر۔"

"امی! آپ دیکھ رہی ہیں' بابا کی حالت کیسی ہے۔ ایسے میں یہ مناسب ہو گا کہ میں جاب چھوڑ کر شادی رچا کر بیٹھ جاؤں؟"

"مائرہ! کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے تمہاری کمائی کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ شادی مناسب عمر میں ہی ٹھیک رہتی ہے۔ مزید انتظار فضول ہے۔ اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی ہے۔ تمہارے لیے باپ نے بھی بچا کر رکھا ہے۔ لڑکیوں کے والدین تو ان کے پیدا ہوتے ہی جہیز کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ خاص کر ہم جیسے مڈل کلاس گھرانوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور مائرہ! تم فکر کیوں کرتی ہو؟ میں جو ہوں۔ مجھے سلائی بہت اچھی آتی ہے اور آج کل تو لوگ سلائی کے اچھے خاصے پیسے دیتے ہیں۔ دو مشینیں موجود ہیں گھر میں۔ سائرہ بھی ہاتھ بٹا لیا کرے گی۔ اب اس نے پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ بس تم نبیل صاحب سے کہو' تمہیں فارغ کر دیں۔"

ماں نے کہا تو وہ بولی "آپ کو اصل بات بتانا پڑے گی۔"

"کون سی بات؟" ماں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! بات یہ ہے کہ میں شاہانہ کی فرم میں جاب نہیں کر رہی بلکہ نبیل ہمدانی کی اشتہاری کمپنی میں ان کی پرائیویٹ سیکریٹری ہوں۔ وہ ایک فیشن شو کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ہماری کمپنی کی بارہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لڑکیوں کا گروپ چنا ہے۔ یہ تمام لڑکیاں تین سال کے لیے باؤنڈ ہو گئی ہیں۔ ان کی شرط یہ ہے کہ لڑکیاں تمام غیر شادی شدہ ہوں اور آئندہ تین سال تک اس بارے میں سوچیں بھی نہیں۔" مائرہ نے اپنی بات مکمل کر کے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں کی نظریں اسے گھور رہی تھیں "تو تم ہماری عزت کو اچھال رہی ہو؟ جھوٹ بولتی رہیں کہ شاہانہ کی فرم میں جاب کر رہی ہوں۔ کچھ اندازہ ہے' تمہارے اس اقدام سے تمہارے معذور باپ کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔ مائرہ! تم نے ہماری دی ہوئی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔"

"امی! یہ سب میں صرف اپنے ہی لیے نہیں کر رہی' آپ سب کے لیے کر رہی ہوں۔ دولت میں بڑی طاقت ہے۔"

"جہنم میں جائے ایسی دولت جو عزت کو داؤ پر لگا کر حاصل کی جائے۔"

"ارے امی! آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ مڈل کلاس گھرانوں کی سوچ ہے۔ برگر فیملی میں جا کر دیکھیے۔ فخر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اس فیشن شو میں حصہ لے رہی ہیں۔ اس اشتہاری کمپنی میں جو لڑکیاں ہیں' ان کا تعلق زیادہ تر برگر فیملی سے ہے۔ شوقیہ جاب کر رہی ہیں اور مجھے تو خود نبیل ہمدانی صاحب نے آفر کی ہے۔ یہ شو یہاں نہیں ہو گا' انگلینڈ میں ہو گا۔ گولڈن چانس ہے میرے لیے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں انگلینڈ جاؤں گی۔"

"کیا کہا تم نے۔ ملک سے باہر جاؤ گی؟ اکیلی! ہوش میں تو ہو؟" ماں نے سخت لہجے میں کہا "کل ہی تم کمپنی میں استعفیٰ دے دو۔ سمجھیں تم؟"

"نہیں امی! یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ کوئی زبردستی ہے؟ والدین کی اجازت کے بغیر تم ملک سے باہر کیسے جا سکتی ہو؟"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں باؤنڈ ہو چکی ہوں اور یہ فیشن شو ہر سال مختلف ممالک میں ہوں گے اور ہر جگہ انہی بارہ لڑکیوں کا گروپ جائے گا۔"

"بس خاموش ہو جاؤ۔ اب مجھے کچھ نہیں سننا۔" ماں کہتی ہوئی اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

حمیدہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی۔ سائرہ بھی کالج جا چکی تھی۔ شاکر الدین اپنے کمرے میں اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ حمیدہ' مائرہ کا کمرا ٹھیک کرنے کے خیال سے ادھر آئی تھی۔ وہ روزانہ ہی چیزیں ادھر ادھر بکھرا کر چلی جاتی تھی۔ ایک ایک چیز انہیں روزانہ سمیٹنی پڑتی تھی۔ وہ ٹیبل پر بکھری ہوئی چیزیں سنبھال کر رکھ رہی تھیں کہ نیچے دبا ہوا پرچہ دیکھ کر چونک گئی۔ اوپر ہی لکھا ہوا تھا۔

"پیاری امی جان! مجھے پتا ہے' آپ سب مجھے خوشی سے اجازت نہیں دیں گے اس لیے میں خاموشی سے جا رہی ہوں۔ جب تک آپ کی نظر سے یہ سطور گزریں گی' جہاز پرواز کر چکا ہو گا۔ میں نے چاہا تھا' مناسب وقت پر میں آپ کو تمام حقیقت بتا دوں گی مگر آپ نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ امی نبیل ہمدانی کے ہمارے اوپر بہت احسانات ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے دگنے ہیں مگر میرے طلب گار تھے۔ ان کے احسانات اتنے تھے کہ میں انکار نہ کر سکی۔ ہر حکم مانتی چلی گئی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ آپ نے مجھے سچ

کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے پتا ہے' میرے اس اقدام سے آپ سب کو دکھ ہو گا مگر میں انجانے میں نبیل ہمدانی کے اعتماد کے جال میں اس طرح جکڑ گئی تھی کہ فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ کبھی کبھی فرشتہ صفت لوگ دھوکا بھی دے دیتے ہیں۔ اب مجھے احسانوں کا بدلہ چکانا ہے۔ امید ہے آپ سب مجھے معاف کر دیں گے۔"

فقط

مائرہ نبیل

خط کیا تھا' ایک دھماکا تھا۔ ماں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ اتنا حوصلہ کہاں سے لائے کہ باپ کو بیٹی کے فرار ہونے کی خبر سنائے۔ آنسو بہت تیزی سے چہرہ بھگو رہے تھے۔ کمرے میں ماں کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اکیلی بیٹھی روتی رہی پھر کچھ سوچ کر شاکر الدین کے کمرے میں چلی گئی۔

شاکر الدین عینک لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ حمیدہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بولے "حمیدہ! اگر ایک کپ چائے مل جائے تو...." جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے انہوں نے غور سے حمیدہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ چونک گئے "کیا ہوا ہے؟ تم رو رہی ہو!" شاکر الدین نے اخبار ایک طرف پھینک دیا۔

حمیدہ میں کچھ کہنے کا حوصلہ نہ تھا۔ الفاظ ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ خاموشی سے پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

پرچہ پڑھتے ہی شاکر الدین کا ذہن بگولے کی طرح چکر کھانے لگا "مائرہ! مائرہ! تم نے یہ کیا کیا؟" ان کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ غم کی شدت سے دل پھٹا جا رہا تھا۔ گھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ سائرہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ دو دن بعد جہانگیر اور ان کی بیگم منگنی کی رسم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔ شاکر الدین کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ حمیدہ کو پریشان سوچوں کی یلغار نے گھیرا ہوا تھا۔ مائرہ نے تو انہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ دونوں میاں' بیوی کو عزت بچانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہانگیر اور ان کی بیگم کو کیا جواب دیں گے؟ لوگوں کے سوالوں سے کس طرح بچا جائے گا؟ دو راتیں گزر گئی تھیں۔ گھر میں ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔

○☆○

"سائرہ بیٹی! کھانا کھالو۔ کل سے یونہی بھوکی ہو۔" ماں کی آواز پر وہ بری طرح چونک گئی۔ تازہ منظر سامنے لوٹ آیا تھا۔ اس نے سرخ آنکھیں ہتھیلی سے رگڑ ڈالیں۔ بے اختیار ماں کے کاندھوں سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ رکا ہوا آنکھوں کا پانی کسی سیلاب کی طرح بہہ نکلا۔

○☆○

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

محافظ

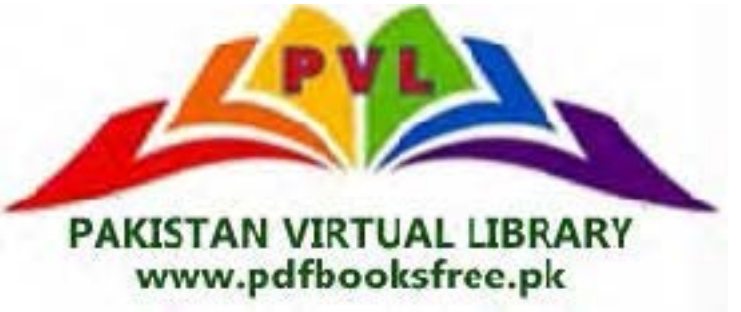

علینا کالج سے نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کی گاڑی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ڈرائیور اسے لینے وقت پر نہیں پہنچا تھا۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ اس خیال سے وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔ کالج کی تقریباً تمام لڑکیاں جا چکی تھیں۔ دوسری شفٹ بھی شروع ہو چکی تھی اور وہ گیٹ کے باہر ہراساں سی کھڑی خالی سڑک کو گھور رہی تھی' تبھی اس سڑک سے ایک سرخ رنگ کی شیراڈ گزری۔ اس کی رفتار کافی تیز تھی مگر فوراً ہی آہستہ بھی ہو گئی' پھر اس نے یوٹرن لیا اور اس کے قریب آکر رک گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ایک پرکشش سا نوجوان بیٹھا تھا۔ علینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ علینا کو بڑے دلفریب انداز میں گھور رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر ان خاتون کو دیکھا جو فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے علینا سے مسکرا کر پوچھا "بیٹی! کہاں جانا ہے' یہاں اکیلے کیوں کھڑی ہو؟"

"جی میں اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی ہوں" علینا نے سرسری انداز میں بتایا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

وہ خاتون بولیں "تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"جی کشمیر روڈ۔"

"اوہو تو بیٹا' بیٹھ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔ تمہیں ڈراپ کر دوں گی" انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پرکشش نوجوان بدستور مسکرا رہا تھا۔ خاتون لب و لہجے اور حلیے بشرے سے کسی اعلیٰ خاندان کی لگ رہی تھیں۔ علینا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

خاتون شاید بہت زیادہ باتونی تھیں' اپنے بارے میں بتاتا کر اس کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور وہ بڑی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سادگی سے ان کے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔ گاڑی جیسے ہی کشمیر روڈ پر مڑی' اس نے کہا "رائٹ پر لے لیں۔"

تھوڑا اندر جا کر اس نے گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رکوادی۔

"جی بہت بہت شکریہ!" علینا نے خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

بھابی ٹیرس پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں مگر کسی اور کی گاڑی سے اترتا دیکھ کر حیران تھیں کہ اپنی گاڑی میں کیوں نہیں آئی۔ وہ تیزی سے نیچے آگئیں۔

علینا اندر آچکی تھی۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔ ڈرائیور کہاں ہے اور یہ کس کی گاڑی میں آئی ہو؟" بھابی بیگم نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"بھابی! دم تو لینے دیں' ویسے ہی میں خوار ہو کر آرہی ہوں" اس نے تیکھے لہجے میں کہا پھر رک کر بولی "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچا ہی نہیں۔ اگر یہ خاتون خود لفٹ نہ دیتیں تو میں وہاں کھڑی انتظار کر رہی ہوتی۔"

"لیکن یہ ڈرائیور کہاں رہ گیا؟ چلو اچھا ٹھیک ہے' تم آگئیں۔ میں تو اتنی دیر سے پریشان ہو رہی تھی کہ اللہ جانے آج تمہیں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ مگر علینا' آئندہ خیال رکھنا۔ کسی انجان شخص کی گاڑی میں کبھی نہ بیٹھنا۔ کسی اجنبی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ عورت ہو یا مرد' کسی کے ماتھے پر کچھ لکھا نہیں ہوتا ناں۔ اکثر لوگ شرافت کا خول چڑھائے پھرتے ہیں" بھابی بیگم نے پیار بھرے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

وہ بولی "بھابی! آپ تو ہر بات میں برائی کا پہلو نکال لیتی ہیں۔ وہ نیک دل خاتون تھیں جبھی میں نے لفٹ قبول کر لی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے علینا مگر آج کل معاشرے میں برائی اس طرح پھیل رہی ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا زمانہ آگیا ہے۔"

"ہاں' یہی نا کہ اچھے خاصے شریف لوگوں پر بھی شک کیا جائے۔ آپ بھی بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہیں" وہ اپنی عادت کے مطابق بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بھابی بیگم ہمیشہ کی طرح صرف کڑھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ انہیں کسی گنتی میں لاتی ہی نہیں تھی۔ بھابی بیگم نے اس کی پرورش ایک ماں کی طرح کی تھی مگر وہ انہیں یہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

علینا وقار احمد چوہدری کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ دو بھائیوں اکرام اور زمان کی اکلوتی بہن تھی۔ وقار احمد کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے والد بڑے چوہدری کے نام سے مشہور تھے۔ دور دور تک ان کا نام جانا پہچانا جاتا تھا۔ علینا کو صرف باپ کی محبت ملی تھی۔ ماں کی محبت سے وہ محروم رہی تھی۔ اس کی پیدائش کے چند ہی گھنٹے بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس وقت وقار احمد کے دونوں بیٹے سمجھ دار تھے۔ اکرام نے بی اے کا ایگزام دیا تھا اور زمان میٹرک کے ایگزام سے فارغ ہو کر رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

وقار احمد اپنی دو اولادوں سے مطمئن تھے کہ ۱۴ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی تو جہاں بیٹی کی خواہش کی تکمیل ہوئی وہاں بیوی کی جدائی انہیں ہراساں کر گئی۔ اس لمحے معصوم بچی علینا نے انہیں بڑا سہارا دیا۔ دونوں بیٹوں پر ماں کی جدائی کا صدمہ پڑا تو گھر میں ایک نہ ختم ہونے والی تنہائی کا سناٹا چھا گیا۔ عورت گھر میں نہ ہو تو گھر سائیں سائیں کرتا ہے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ وقار احمد جو شیخوپورہ میں اپنی جوائنٹ فیملی کے ساتھ بڑے چوہدری کی حویلی میں رہتے تھے' وہ شادی کے دو سال بعد ہی کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن وہیں حویلی میں بڑے چوہدری کے ساتھ تھے۔

وقار احمد نے کراچی آکر اپنی ہوزری کی فیکٹری لگائی جو بہت اچھی طرح چل رہی تھی۔

وقت کا پہیا سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی فیملی کے ساتھ شیخوپورہ جاتے رہتے تھے۔ اب شیخوپورہ والی حویلی میں اچھا خاصا بڑا کنبہ آباد تھا۔ دونوں بھائیوں کے بچے' بہن کے بچے' حویلی میں خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔ اس شام بڑے چوہدری موڈ میں تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ شام کی چائے کا دور چل رہا تھا۔ وقار احمد کی بیگم ثریا بھی موجود تھیں تبھی بڑے چوہدری نے بات چھیڑ دی "وقار بیٹا! میں نے سوچا ہے کہ عفت کو اکرام سے منسوب کر دیں۔ عفت' وقار احمد کے چھوٹے بھائی افضال کی بڑی بیٹی تھی۔

"جی ابا میاں! آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"کیوں افضال!" وقار احمد نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو افضال نے بھی ان کی بات کی تائید کی اور یوں عفت اکرام سے منسوب ہو گئی۔ ابھی وہ نائنتھ کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ بڑے چوہدری نے اپنے خاندانی اصول پر عمل کرتے ہوئے سب بچوں کے رشتے آپس میں طے کر دیے تھے۔ آج وہ بیٹے اور بیٹیوں کو اسی لیے اکٹھا لے کر بیٹھے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں سب بچوں کے رشتے جوڑ دینا چاہتے تھے۔ خاندان سے باہر سے رشتے لینے یا دینے کا ان کے یہاں رواج نہیں تھا۔ افضال کے دو ہی بچے تھے۔ بیٹی عفت اور ایک بیٹا فیضان جس کی عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی۔ بڑے چوہدری اپنی بڑی بہو ثریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "وقار! اللہ نے تمہیں اگر ایک بیٹی بھی دی ہوتی تو میں فیضان کا رشتہ اس سے جوڑ دیتا" بڑے چوہدری اتنا کہہ کر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تو وقار احمد' ثریا کی طرف دیکھ کر مسکرائے "کچھ سنا آپ نے' ابا میاں کو ایک عدد پوتی کی خواہش ہے اپنے لاڈلے پوتے فیضان کے لیے۔"

"ارے ہٹیں بھی!" ثریا نے کچھ جھینپ کر کہا تو وقار احمد کا زبردست قہقہہ گونجا۔

"ارے وقار بھائی! بہت خوش ہیں' بات کیا ہے؟" ان کی چھوٹی بھابی نگہت نے کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"لیجئے آپ کو پتا نہیں' ابا میاں کو پورے چودہ سال بعد ایک عدد پوتی کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔"

"ابا میاں کا خیال بالکل درست ہے بھئی' میرے فیضان کے لیے کچھ کر لیں ورنہ ابا میاں تو خاندان سے باہر شادی کرنے ہی نہیں دیں گے" نگہت نے خوب چہکتے ہوئے کہا تو ثریا بولیں۔

"اچھا تو تم بھی شروع ہو گئیں۔"

نگہت بھرپور انداز میں مسکرائیں۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

قہقہوں اور ٹھٹھوں کے درمیان وقت گزرتا چلا گیا۔

کبھی کبھی منہ سے نکلی بات فوراً عرش تک پہنچ جاتی ہے۔ چودہ سال بعد ثریا امید سے ہوئیں تو بڑے چوہدری کی یہی خواہش تھی کہ اس بار پوتی آئے۔ وقار احمد خود بھی یہی چاہتے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر گیا۔ بچی نے دنیا میں آکر بڑے چوہدری کی خواہش کی تکمیل تو کر دی مگر ثریا زندگی کی بازی ہار گئیں۔

ان کی دیورانی نے بڑی چاہ سے اس بچی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنادی اور اسے اپنے بیٹے فیضان سے منسوب کر دیا۔ بڑے چوہدری بہت خوش تھے۔ بڑے چوہدری کے اصرار کے باوجود وقار احمد دوسری شادی پر راضی نہ ہوئے تو بڑے چوہدری نے فوری طور پر ایک اور فیصلہ کر ڈالا۔ عفت اور اکرام کی شادی کا فیصلہ۔ ابھی عفت کی تعلیم نامکمل تھی مگر بڑے چوہدری کا فیصلہ اٹل تھا کہ اکرام کا گھر بسا دیا جائے تو یوں بچی کی پرورش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

عفت رخصت ہو کر کراچی آگئیں۔ ابھی ان کی عمر میں خود لڑکپن تھا مگر اس عمر میں انہیں علینا کی ذمے داری دی گئی تو وہ علینا کو اپنے ساتھ لے آئیں۔

وقار احمد کی خوشی دوبالا ہو گئی تھی۔ ویران گھر میں رونق لوٹ آئی تھی۔ چھوٹا بیٹا زمان اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

عفت، علینا کا ہر طرح کا خیال رکھتی تھیں۔ علینا عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جہاں لڑکیوں کو قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

شعور کی یہی عمر ہوتی ہے جہاں ذہن کو صحیح رہنمائی نہ ملے تو ذہن غلط راستوں پر بھی بھٹک جاتا ہے۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو علینا ان کے شانوں سے اوپر نکل رہی تھی۔ سبھی اس کو بہت پیار کرتے تھے مگر اتنی محبتیں، چاہتوں کے باوجود اسے ماں کی کمی کا کمپلیکس رہا تھا جبکہ عفت نے اس کی دلجوئی ایک ماں کی طرح کی تھی۔ اس کی پوری توجہ علینا پر رہی تھی کیونکہ شادی کے دس سال تک ان کے یہاں اولاد کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔

علینا، عفت کے ساتھ ساتھ ان کے بھائی اور اپنے منگیتر فیضان کے نام سے بھی چڑتی تھی۔ فیضان جب بھی کراچی آتا، اس کا رویہ سرد ہوتا۔ وہ جتنا اس سے دور بھاگنا چاہتی تھی، فیضان اتنا ہی اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فیضان کے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ تھا مگر علینا اپنے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں رکھتی تھی۔

عفت نے یہ تمام باتیں محسوس کی تھیں مگر وہ خاموش رہنے پر مجبور تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ علینا خود ہی ٹھیک ہو جائے گی اور وہ یہی چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد میٹرک کے بعد ہی علینا کی شادی ہو جائے مگر علینا نے کالج میں ایڈمیشن لے کر انہیں ایک بار پھر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

عفت ان دنوں بڑے مشکل ترین دوراہے پر کھڑی تھیں۔ علینا ان کی نند بھی تھی اور ان کے بھائی فیضان کی امانت بھی مگر ایک رشتہ جو انہوں نے خود اپنے دل سے جوڑا ہوا تھا وہ ان تمام رشتوں پر حاوی تھا۔ انہوں نے علینا کو ایک ماں کی طرح پالا تھا۔ ان کی اور اسکی عمر میں ایک اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ وہ ان کے سامنے کی بچی تھی اس لیے انہوں نے ہر ہر قدم پر ایک ماں کی طرح رہنمائی کی تھی۔

عفت اپنے روم میں اکیلی بیٹھی سوچے جا رہی تھیں پھر اس کے ساتھ اکثر یوں ہونے لگا کہ ریڈ شیراڈ میں وہ پرکشش نوجوان علینا کو کالج کے گیٹ پر ملنے لگا لیکن وہ اسے دیکھ کر بھی انجان بن جاتی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی آتی۔

اس دن پھر وہی ہوا۔ کالج سے نکلتے ہی وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا "میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

"کوئی خاص بات؟" اس نے پوچھا۔

"یونہی، ضروری تو نہیں بندہ کسی سے کسی غرض سے ہی ملے۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "لگتا ہے کہ آج بھی آپ کی گاڑی نہیں آئی، چلئے میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

وہ خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔ آج اس نے اس کی طرف زیادہ دیکھا بھی نہیں تھا۔

"بس یہاں روک دیں" علینا نے گھر سے کافی دور گاڑی رکوا دی اور اتر گئی۔

"مگر ابھی تو سامنے کی پوری سڑک باقی ہے۔"

"جی! وہ اگر بھابی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی۔"

"او آئی سی، آپ کو بھابی کا بہت خوف ہے۔ آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں؟" اس نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا پھر بولا "آپ نے نام تو نہیں پوچھا میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ مجھے حسیب کہتے ہیں" اس کے ہونٹوں کی دلفریب مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ علینا بھی مسکراتی ہوئی اپنی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ حسیب دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ڈرائیور وقت پر کالج نہیں پہنچتا اور کبھی عفت اس سے کہہ دیتیں کہ علینا آج ویگن سے آجانا۔ مجھے گاڑی لے کر شاپنگ کرنے جانا ہے۔ عفت ان دونوں علینا کی شادی کی تیاری میں مصروف تھیں۔ ان کی شاپنگ بڑی تیزی سے جاری تھی۔

یوں ان دونوں کو ملنے کا بہانہ ملتا چلا گیا۔ علینا حسیب کی شخصیت کے سحر میں گم ہو چکی تھی۔ اسے یہ سب کچھ بہت انوکھا لگ رہا تھا۔ محبت کے لطیف جذبے سے آشنا ہوئی تو دنیا ہی حسین لگنے لگی۔ وہ حسیب کی محبت میں سرشار ہو کر آنکھ بند کر کے چل پڑی تھی۔ ملاقاتیں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان دنوں وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ اس کے ایگزام سے فارغ ہوتے ہی شادی کا ہنگامہ شروع ہونے والا تھا۔ اس نے اس بارے میں حسیب کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس شام وہ اس کے ساتھ ساحلِ سمندر پر آئی ہوئی تھی۔ ساحلِ سمندر کی سیر کرتے ہوئے حسیب نے علینا سے کہا "میں نے امی سے تمہارے لیے بات کی ہے۔ وہ راضی ہیں اور جلد ہی تمہارے گھر رشتہ لے کر آئیں گے۔"

علینا کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

"تم خاموش کیوں ہو، کچھ تو بولو۔"

وہ بولی "حسیب! ابھی ہماری ملاقات کو چند ماہ ہوئے ہیں۔ تم میرے خواب کی تکمیل ہو مگر..." وہ ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بولو نا مگر کیا۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لیکن وہ کچھ نہ بولی۔

حبیب نے کہا "یہی کہنا چاہتی ہو ناں کہ بھابی وغیرہ راضی نہیں ہوں گی۔ تمہارے خاندان میں باہر شادی نہیں ہوتی مگر علینا ایک راستہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔ ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ میری امی تو راضی ہیں' رہی تمہارے گھر والوں کی بات تو بعد میں ان کو منا لینا۔"

"نہیں حبیب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" علینا نے گھبرا کر کہا۔

"اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے تو پھر ایسا کرنا ہی ہوگا" حبیب نے اٹل لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی "چلو واپس چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "میرا بھی یہی خیال ہے" وہ دونوں واپسی کے لیے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

علینا اکثر کالج سے لیٹ آنے لگی تھی۔ عفت پوچھتیں تو کہہ دیتی "بھابی! میں رافیہ کی طرف چلی گئی تھی۔ نوٹس تیار کرنے تھے" ان دنوں اچانک ڈرائیور بھی چھٹی پر چلا گیا تھا اور علینا کو روزانہ بہانا بنانے میں آسانی ہو گئی تھی۔ عفت جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ عفت نے اندر ہی اندر خاموشی سے وقار احمد کو اتنی جلدی شادی کر دینے کے لیے تیار کیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ عفت کی بات مانی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر عفت جیسی سمجھ دار بہو گھر میں نہ ہوتی تو علینا کی پرورش کا مسئلہ تھا۔ عفت کا علینا پر اتنا ہی حق تھا جتنا ایک ماں کا ہوتا ہے مگر وہ اکثر علینا کی تلخ کلامی پر کڑھ کر رہ جاتے تھے۔ وہ عفت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جب سے سمجھدار ہوئی تھی' اس کے مزاج میں چڑچڑا پن زیادہ آگیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھی۔ عفت کے لہجے میں جتنی مٹھاس ہوتی تھی' علینا کے لہجے میں اتنی ہی کڑواہٹ ہوتی۔ ایگزام سے فارغ ہوئی تو گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔ حبیب سے ملنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو حبیب کی محبت میں سرشار ہو کر انجانے راستوں پر چل پڑی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بچپن سے اپنے کزن فیضان سے منسوب کر دی گئی ہے مگر اس کے باوجود اس نے اپنی پلکوں پر حبیب کے خواب سجائے تھے۔

"ہوں' بہت زعم ہے بھابی کو اپنی فتح کا۔ سب مٹی میں ملا دوں گی۔ اگر بھابی چاہتیں تو یہ شادی ابھی ٹل سکتی تھی مگر بھابی تو جلد سے جلد مجھ سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں ہیں۔ پاپا کو الگ اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے" عفت کو وہ اپنی راہ کا پتھر سمجھنے لگی تھی۔

وقت تیزی سے گزر گیا اور گھر میں شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ عفت نہ جانے کس کام سے علینا کے کمرے میں آئی تھیں لیکن علینا دروازے پر ہی خط پڑھنے میں اس طرح محو تھی کہ اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ اس کے پیچھے بھابی کھڑی ہیں اور وہ بھی خط پڑھ رہی ہیں۔

"جان من علینا!"

"پیار بھرا اسلام!

ایک ماہ گزر گیا لیکن تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کل رات فون پر تم نے یہ بتا کر میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ تمہارے گھر کے سامنے کئی چکر لگائے مگر تم ٹیرس پر بھی نظر نہیں آئیں۔ یہ

خط ایک بچے کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ تم نے مجھے اس بات سے بے خبر رکھا کہ تم پہلے ہی منسوب ہو۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟ تمہارے وہ تمام خطوط اور وہ تصویریں جو ہم نے ساحلِ سمندر پر بنوائی تھیں' میرے پاس محفوظ ہیں۔ انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ کئی بار ان خطوط کو پڑھ چکا ہوں۔ کیا وہ سب فریب تھا؟ تمام رات سوچتا رہا۔ تمہیں خط لکھتا رہا اور پھاڑتا رہا۔ مجھے پتا ہے تم مجبور ہو گی لیکن علینا' ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ تمہاری برات میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ اتوار کو تمہاری برات ہے۔ ہفتے کی رات میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اپنے گھر کا ایڈریس اوپر لکھ رہا ہوں۔ تم وہاں چلی آنا۔ میری امی تمہیں ہر حالت میں قبول کرنے پر راضی ہیں۔ میری ماں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہوگا۔ پھر کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔ چند دن بعد تم اپنے گھر والوں کو منا لینا۔ والدین ہمیشہ اولاد کی بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دیتے ہیں۔"

علینا! میری باتوں پر غور کر کے عمل کرنا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری آمد کا منتظر۔

تمہارا حبیب!"

عفت بھابی کے اندر دھماکے ہو رہے تھے مگر وہ سانس روکے خاموش کھڑی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

"میں ضرور آؤں گی حبیب! مجھے تمہاری محبت کی قسم' میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکتی" وہ خط مٹھی میں بند کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ بھابی' جو گم صم کھڑی تھیں' بری طرح چونک گئیں۔

"علینا! یہ سب کیا ہے؟ یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟" عفت بھابی کی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چونکتے ہوئے مڑی۔ بھابی اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"بھابی بیگم! میرا خیال ہے جب آپ سب کچھ جان ہی چکی ہیں تو سوال کیسا؟"

"تمہیں کسی کی عزت کا خیال ہے؟" انہوں نے تادیبی لہجے میں کہا۔

"بھابی! محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"ہنہ! یہ محبت کی توہین ہے۔ یہ لڑکا تمہیں ورغلا رہا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں کر کے لڑکیاں ساری زندگی بلیک میل ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے تمہیں قدم قدم پر سمجھایا تھا مگر تم نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دو دن بعد تمہاری رخصتی ہے علینا! مشرقی معاشرے میں لڑکیاں اپنے والدین کی عزت پر قربان ہو جاتی ہیں۔ تمہیں اس قسم کی حرکتیں زیب نہیں دیتیں" عفت کا لہجہ خاصا سخت ہو گیا تھا۔

"بھابی! اونچا نہ بولیں۔ میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ فیضان کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے مگر آپ نے میری ایک نہ مانی۔ حبیب آپ سے مل کر میرا رشتہ مانگنا چاہتا تھا۔ اس کی امی آنے کو تھیں مگر مجھے معلوم تھا آپ ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں آپ سب کی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ جاؤں؟"

"علینا! آہستہ بولو" عفت نے دروازہ بھیڑتے ہوئے کہا" علینا ڈیئر! میں اس گھر کی محافظ ہوں اور ایک اچھے محافظ کا کام ہوتا ہے حفاظت کرنا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں جلد

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سے جلد اس کے پاس لوٹادوں جس کی تم امانت ہو۔"

"آپ ہی ہماری محبت کی دشمن ہیں" اس نے بے انتہا بدتمیزی سے کہا۔

"علینا! اگر میں تمہاری دشمن ہوتی تو یوں بند کمرے میں سرگوشیاں نہ کر رہی ہوتی۔ یہ خط تمہارے بھائی اور باپ کے سامنے رکھ دیتی جو تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ تم نے باپ اور بھائی کی محبتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ اس لوفر لڑکے کی خاطر' جس کے ایک ایک لفظ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنا فریبی ہے۔ اس بھول میں بھی نہ رہنا علینا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو علینا ڈیئر! والدین کی عزت پر ایسی ہزار محبتیں قربان کی جاسکتی ہیں" بھابی بیگم کا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"پلیز بھابی! فلسفہ بند کریں۔"

"نہیں علینا! بہت ہو گیا' یہ مت بھولو کہ میرا تم پر پورا حق ہے۔ اختیار ہے۔ یہ بات یاد رکھو' لڑکیاں باپ کی دہلیز کا مان ہوتی ہیں۔ تم جسے محبت سمجھ رہی ہو وہ دھوکا ہے' فریب ہے۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ" بھابی بیگم نے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ عفت خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

○☆○

شام ڈھل رہی تھی۔ علینا اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ لڑکیاں سب اوپر تھیں۔ بھابی بیگم دوپہر سے کہیں گئی ہوئی تھیں اور ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

"عفت کہاں گئی ہیں۔ اکیلی گئی ہیں' کسی کو ساتھ ہی لے لیا ہوتا" وہ یہ کہتے ہوئے ٹیرس کی طرف گئے تو دیکھا' عفت کی گاڑی پورچ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے اتر آئے "حد ہو گئی عفت! دوپہر کی گئی اب لوٹی ہو؟"

"کیا کروں اکرام! فہمیدہ کا کارڈ رہ گیا تھا۔ وہ دینے گئی تھی' بس ادھر ہی دیر لگ گئی۔"

"ارے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہاری باتونی دوست فہمیدہ نے تمہیں باتوں میں لگا لیا ہو گا۔ دنیا جہاں کے قصے لے کر بیٹھ گئی ہو گی۔"

"ارے یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ اپنے لیے شاپنگ بھی کرنا تھی۔ اس کے ساتھ بازار چلی گئی" عفت کہتی ہوئی علینا کے کمرے میں آگئیں۔

علینا نے غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بہت مطمئن نظر آرہی تھیں۔

"ہونہہ! بھابی کس قدر مسرور اور خوش ہیں" وہ سوچ کر رہ گئی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ وضو کرنے علینا کے واش روم میں چلی گئیں۔

عفت نے جائے نماز بچھائی۔ دو رکعت شکرانے کے نفل ادا کیے کہ وہ جس کام سے فہمیدہ کے پاس گئی تھیں وہ کام ہو گیا تھا۔ اب وہ بہت مطمئن تھیں۔

آج گیپ کا دن تھا۔ عفت سب کاموں سے فارغ ہو کر اوپر آگئیں "لڑکیو! آج آرام کا دن ہے۔ یہ ڈھول اٹھا کر رکھ دو" تایا جان بھی جلدی سونا چاہ رہے ہیں۔ تم لوگ بھی سو جاؤ۔ تھکن بہت ہے' نیند پوری ہو جائے

گی تو کل صبح سب فریش رہیں گے" عفت' علینا کو لیے نیچے آگئیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور عفت اپنے کمرے میں۔

عفت کا کمرا اس کے کمرے سے کافی فاصلے پر تھا مگر ان کے کمرے کی ایک کھڑکی اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھلتی تھی۔

اکرام' فیضان کی کوٹھی پر گئے ہوئے تھے۔ بارہ بج رہے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ فیضان اپنی فیملی کے ساتھ دو روز پہلے ہی شیخوپورہ سے آکر گلشن والی کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ یہ کوٹھی زمان کی تھی جو وقار احمد نے زمان کی شادی پر خریدی تھی۔ زمان کی شادی ان کی پھوپو کی بیٹی سعدیہ سے ہوئی تھی اور وہ شادی کے بعد واپس امریکا چلے گئے تھے۔ زمان کی یہ کوٹھی گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ علینا کو رخصت ہو کر وہیں جانا تھا۔ فیضان کا قیام کراچی کے لیے ایک ہفتے کا تھا۔ اس کے بعد انہیں واپس شیخوپورہ والی حویلی میں چلے جانا تھا۔ بڑے چوہدری کی یہی خواہش تھی کہ علینا رخصت ہو کر ان کی حویلی میں آجائے۔

علینا اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ حسیب نے کہا تھا' وہ دوبارہ فون کرے گا۔ اس نے ابھی تک فون نہیں کیا تھا۔ فون کا خیال آتے ہی وہ بری طرح چونک گئی۔ سائڈ ٹیبل پر سے اس کا موبائل فون غائب تھا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ یہ بھابی کی کارستانی ہے۔ وہ میرا فون بھی اٹھا کر لے گئیں۔ وہ حسیب کی محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ رشتوں کا احترام تک بھول گئی تھی" علینا! یاد رکھو' لڑکیاں باپ کی دہلیز کا مان ہوتی ہیں" بھابی کا جملہ اس کے ذہن میں گونجا۔

"ہونہہ! دہلیز کا مان' ان لوگوں نے کون سا میرے جذبات' میرے احساسات کا مان رکھا ہے۔ اپنی خاندانی روایتوں اور اصولوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ مجھ سے کسی نے یہ نہ پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ پھر میں کیوں اپنے جذبوں' اپنی خواہشوں کی قربانی دوں۔"

اس کی ساری سوچیں باغی تھیں۔ وہ ان سب کو شکست دینا چاہتی تھی۔ اس وقت وہ بالکل اندھی ہو رہی تھی۔ اسے بوڑھے باپ کی عزت کا بھی خیال نہ تھا۔

"حسیب نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں بعد میں سب کو منالوں گی۔ ابھی اس طوفان کو روکنا ہے جو مجھے بہا کر لے جائے گا۔"

"عورت کی عزت آئینے سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے' پاگل مت بنو۔ کیا تم چاہتی ہو تمہارا باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے؟ کیا وہ تمہارے اس اقدام کے بعد زندہ رہ سکے گا؟ کیا اسے زمانے کی نظریں زندہ رہنے دیں گی؟ اپنا ارادہ بدل دو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اسی میں تمہاری بقا ہے۔ چند دنوں کی محبت کی تکمیل کے لیے خونی رشتوں کو فراموش کر کے کس بھنور میں چھلانگ لگانے جا رہی ہو۔ ایک ایسی دلدل جس سے تم کبھی باہر نہ آسکو گی۔ واپسی کے تمام دروازے تم پر بند ہو جائیں گے" عقل اسے سمجھانے پر لگی ہوئی تھی مگر وہ تو تمام فیصلے دل کے اکسانے پر کیے بیٹھی تھی "جاؤ علینا! وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کہیں وہ تمہاری محبت میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ کیا تم کبھی اپنے آپ کو معاف کر سکو گی؟" دل کسی شیطان کی طرح اسے بہکا رہا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رات گزرتی جارہی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے دروازے سے بھابی کے کمرے کی طرف نظر ڈالی۔ کمرے کی کھڑکی اتنی سردی کے باوجود کھلی ہوئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ برآمدے میں زیرو بلب کی ملگجی روشنی ہمیشہ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کالی گرم شال سے ڈھانپ لیا تھا۔ صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ حسیب نے کہا تھا "تم خالی ہاتھ آنا۔ مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔" حسیب کا جذباتی جملہ اس کے ذہن میں گونج گیا۔

"ہاں حسیب! مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تمہیں نہ میرے باپ کی دولت کا لالچ ہے' نہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو" اس نے سوچتے ہوئے آگے قدم بڑھائے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آکر برآمدے کی اس سائڈ پر مڑگئی جدھر باہر کا گیٹ کھلتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ ابھی صبح نمودار ہونے میں خاصا وقت تھا۔ حسیب کو اگلے چوراہے سے اسے پک کرنا تھا۔

سردیوں کی رات تھی۔ سب تھکے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ یوں بھی گرم بستروں میں نیند گہری ہوجاتی ہے۔ بھابی بیگم بھی آج بہت بے خبر اور بے فکر ہو کر سوئی ہیں۔ اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دبے قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی۔

"رک جاؤ علینا! کہ تمہارا محافظ بے خبر نہیں ہے۔"

بھابی کی دبی دبی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ عفت نے آگے بڑھ کر سختی سے اس کی کلائی تھامی اور دبے قدموں اسے اسی کے کمرے میں لے آئیں۔ اندر آتے ہی انہوں نے دروازہ بند کردیا "علینا! میں نے تمہیں توجہ دی۔ محبت دی۔ دس سال تک اولاد سے محروم رہی۔ اس میں بھی شاید خدا کی مصلحت تھی تاکہ میں تمہیں پوری توجہ دے سکوں پھر عبید کی پیدائش کے بعد بھی میں نے تمہاری طرف سے کبھی غفلت نہیں کی مگر۔۔۔" عفت کا چہرہ شدت غم سے دھواں دھواں ہو رہا تھا "علینا! ہم سب کی عزت کو داؤ پر لگا کر اس کے پاس جارہی تھیں' میں تم سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ خط پڑھ لینے کے بعد میں ایک دن بھی چین سے نہ سو سکی۔ تمہاری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے اس خط نے مجھے ہوشیار کردیا تھا۔ وہ تمہیں بلیک میل کرسکتا تھا۔ جس ایڈریس پر تمہیں اس نے بلایا تھا' کل دوپہر دو بجے اس کی قیام گاہ پر پہنچی جہاں کا اس نے ایڈریس لکھا تھا۔ میں اکیلی نہیں تھی۔ میرے ساتھ فہمیدہ کے شوہر ایس ایچ او فخرزمان بھی تھے۔ انہوں نے بلیک میل کرنے کے الزام میں اس کی ایف آئی آر کاٹ کر گرفتاری کے وارنٹ لے لیے تھے۔

اچھا خاصا خوبصورت بنگلا تھا۔ باؤنڈری کے چاروں طرف مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ اندر سے لاک تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ فخرزمان کود کر اندر گئے اور گیٹ اندر سے کھول دیا۔ میں گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ میں نے چہرہ چادر کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ بنگلے کے اندر داخل ہوتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں کوئی فیملی وغیرہ نہیں رہتی

ہے۔ تمام کمروں کی کھڑکیاں' دروازے بند تھے۔ باؤنڈری میں لگے پودے خستہ حال ہورہے تھے۔ پیپل کے درخت کے سوکھے زرد پتے میرے قدموں تلے آکر عجیب سی آواز پیدا کررہے تھے۔ میں ان پتوں سے بچ کر چلنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں بڑھتے ہوئے اچانک رک گئی۔ آگے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھی' اندر جھانکا اور میرا سر بری طرح گھوم کر رہ گیا۔ دو لڑکیاں بے ترتیب لباس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"واہ! کیا نام ہے اس کا' علینا ..... وہ کب تک آئے گی؟" ایک عورت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"فکر مت کرو آنٹی! آج رات وہ یہاں پہنچ جائے گی' سودا پکا" ایک لڑکے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ دونوں آڑ میں تھے۔ میں شکل دیکھ نہ سکی تھی مگر جو کچھ سنا تھا وہ ان لڑکیوں کی تباہی کی پوری داستان سنا رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ ان کا دھندا کیا ہے۔ تبھی لڑکے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"اوہ! تو تم اسی وقت آگئیں" وہ نشے کے انداز میں لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا "لو آنٹی! تمہارا کام تو ہوگیا مگر مگر تم آئیں کیسے ..... گیٹ تو لاک تھا؟" اسے جیسے ہوش آگیا اور اسی لمحے فخرزمان نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر پستول نکال لیا۔ دونوں لڑکیاں سہم کر الگ کھڑی ہوگئیں۔ اس عورت کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ وہی تھی جس کی گاڑی میں تم پہلی بار گھر آئی تھیں اور شاید وہ لوفر حسیب ہی تھا جو تمہارے سودے کی بات کررہا تھا۔ دونوں کم عمر لڑکیوں کا تعلق ملتان سے تھا جنہیں وہ محبت کے جال میں پھنسا کر لایا تھا۔ دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد ان لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

مجرم چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو' قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ حسیب اور اس عورت کے خلاف تمام ثبوت اسی کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔ دونوں لڑکیاں مووی کیمرے' جس سے وہ غیر اخلاقی ویڈیو بنا کر انہیں مہنگی قیمت پر غیر ممالک میں فروخت کردیتے تھے۔ حسیب کے ساتھ اس دھندے میں بازاری عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ معتبر خاتون جو تمہیں اعلیٰ خاندان کی لگی تھیں' بازارِ حسن کی مشہور طوائف تھی۔ باقی باتیں صبح کے اخبار میں پڑھ لینا۔"

علینا کے لیے یہ سب کچھ ایک دھماکے سے کم نہ تھا۔ خوابوں کی تکمیل کے لیے دہلیز کا مان لٹانے چلی تھی۔ بھابی اپنی بات مکمل کرکے خاموش ہوئیں تو اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ وہ بھابی سے نظر نہیں ملا پارہی تھی۔

"بھابی' بھابی! کسی کو کچھ نہ بتایئے گا۔ میرا بھرم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ فیضان کو پتا چل گیا تو میں ساری زندگی سر اٹھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ کاش' کاش! میں نے آپ کی باتوں کو سمجھا ہوتا۔ آپ کا مذاق نہ اڑایا ہوتا تو آج یوں پشیمان نہ ہوتی۔ مجھے معاف کردیں بھابی!" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ نظر اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔

"پگلی! کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ سمجھو یہ بات میرے سینے میں دفن ہوگئی۔ حسیب کے پاس سے وہ تمام خط حاصل کرلیے اور جلادیے جو تم نے اسے لکھے تھے۔ تمہاری وہ چند تصویریں بھی جو تم نے ساحلِ سمندر پر بنوائی تھیں' تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری تو بس یہی دعا ہے کہ تم اور فیضان خوش گوار زندگی بسر کرو۔ رہی احسان والی بات تو علینا! کوئی بھی ماں اپنی بیٹی پر احسان نہیں کرتی۔ اپنا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

فرض ادا کرتی ہے۔ماں اپنے گھر' اپنے بچوں کی محافظ ہوتی ہے۔یہ میرا فرض تھا' احسان نہیں۔"

علینا نے نظر اٹھا کر بھابی بیگم کی طرف دیکھا۔بھابی کے چہرے پر ایک ماں کا تقدس نمایاں تھا۔علینا کی نظر ندامت کے بوجھ سے جھکتی چلی گئی۔

○☆○

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

المیہ

تپتی دوپہر میں وہ بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔اس کی بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

تبھی اچانک فیضان کی بائیک اس کے نزدیک آکر رکی۔

وہ ایک دم چونک گئی۔

"اب حیران نہ ہو' بیٹھ جاؤ۔میں گھر ہی جا رہا ہوں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔

"کیا سوچ رہی ہو' گرمی بہت ہے' پگھل جاؤ گی۔دھوپ کی تپش سے تمہارا خوب صورت رنگ کالا ہو جائے گا" فیضان نے سرگوشی کی۔

"تم کو اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بھئی ہم فکر نہیں کریں گے تو بھلا کون کرے گا۔اسی فکر میں تو ادھر آنکلا کہ محترمہ بس اسٹاپ پر کھڑی تپ رہی ہوں گی۔چلو اب زیادہ اوور ایکٹنگ نہ کرو۔لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔اسٹاپ پر کھڑے کئی افراد ان کی طرف متوجہ تھے۔

"تو پھر تم جاتے کیوں نہیں ہو یہاں سے' مجھے نہیں بیٹھنا تمہاری بائیک پر۔اتنی تیز دوڑاتے ہو کہ میرا دم نکل جاتا ہے۔اُس دن میں نے قسم کھالی تھی' اب تمہاری بائیک پر کبھی نہیں بیٹھوں گی۔"

فیضان نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی۔بولا کچھ نہیں' خاموشی سے اپنی بائیک دوڑا لے گیا۔

اسی لمحے اس کی بس آگئی تو وہ مسکراتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔

بس میں پہلے ہی خاصا رش تھا۔اسے گیٹ پر کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی تھی۔فیضان کا غصے سے بھرپور چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔افزا کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

فیضان اس کا کزن تھا۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ وہ اس کی خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ خالہ کا انتقال ایک حادثے میں اس وقت ہو گیا تھا جب وہ پانچ سال کا تھا۔

فیضان کے پاپا وقار علی اچھے خاصے بزنس مین تھے اور زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے فیضان کو اس کی خالہ یعنی افزا کی امی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ فیضان یہاں زیادہ خوش رہے گا۔ وہ تنہا اسے کہاں لیے پھرتے۔ ان کا ایکسپورٹ کا بزنس دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔

افزا بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے ابو ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے۔ اچھی خاصی گزر بسر ہو رہی تھی۔ گھر اپنا تھا' اخراجات بھی زیادہ نہیں تھے۔ فیضان کی پڑھائی وغیرہ کے اخراجات کے لیے وقار ہر ماہ ایک معقول رقم منی آرڈر کر دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نفیسہ نے اپنی زندگی میں افزا کو فیضان کے لیے مانگ لیا تھا۔ ان دونوں کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ وہ بچپن ہی سے ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ ان کی راہ میں سماج کی کوئی دیوار نہیں تھی۔

ان دنوں افزا فورتھ ائر کے ایگزام میں مصروف تھی اور فیضان انجینئرنگ کی ڈگری لیے اپنی قابلیت کے مطابق جاب حاصل کرنے میں سرگرداں تھا۔

یوں تو اسے کسی جاب کی ضرورت نہیں تھی۔ وقار علی کا سب کچھ اسی کے لیے تھا۔ ان کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر ان کا بزنس سنبھالے مگر فیضان خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ وہ بچپن سے باپ کی شفقت سے دور رہا تھا۔ وقار علی نے اسے آسائشیں تو بہت دی تھیں مگر ان کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ ماں کی محبت سے تو محروم تھا ہی' باپ کی شفقت بھی اس نے نہیں دیکھی تھی شاید اسی لیے اس کے اندر خودداری اور انا بہت تھی۔ وہ سب کچھ اپنی محنت' اپنی کمائی سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تب باپ کے بزنس کو سنبھالنے کے بارے میں سوچوں گا۔

وقار علی بزنس ٹور پر ایک دو دن کے لیے پاکستان آتے تھے تو فیضان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان کی اسی بات نے فیضان کو ان سے بدگمان کر دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ وقار علی کو صرف دولت کمانے سے دلچسپی ہے جبکہ وہ باپ کی محبت کا طلب گار تھا' ان کی توجہ چاہتا تھا مگر وقار علی یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں' فیضان ہی کے کام آنا ہے۔ اس کے برعکس فیضان کو بے تحاشا دولت سے نفرت تھی۔ وہ ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ ان کے بزنس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو جلد سے جلد ایک اچھی جاب ملنے کے بعد افزا کو ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا جو اس کی محبت تھی' ساری دنیا اسی پر ختم تھی۔ اسے اپنی کمائی سے ایک گھر بنانا تھا' ایسا گھر جو صرف اس کا اور افزا کا گھر کہلائے مگر اس کے لیے اسے تھوڑا وقت درکار تھا۔

اور وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔

آج صبح ہی صبح افزا سے اس کی اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے والد کا بزنس سنبھال لے۔

"دیکھو فیضان' اس طرح کر کے تم امی ابو کو خالو کی نظروں میں بدگمان کر رہے ہو۔"

"کیا کہا تم نے' میں بدگمان کر رہا ہوں" فیضان نے تُرش لہجے میں کہا۔

"ہاں' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے' خالو نے ابو سے فون پر کیا کہا ہے؟" افزا نے رکے رکے لہجے میں کہا۔

"بتاؤ' کیا کہا ہے پاپا نے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"یہی کہ آپ لوگوں نے فیضان کو مجھ سے اتنا دور کر دیا ہے کہ وہ میری کوئی بات مانتا ہی نہیں۔ اس کی نظر میں میری کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ سارا الزام امی ابو پر آگیا ہے۔ ظاہر ہے تم اس طرح کرو گے تو وہ یہی کہیں گے۔"

"اچھا' تم وکالت نہ کرو پاپا کی۔ میں اپنا مقام اپنی جدوجہد سے بنانا چاہتا ہوں۔ جب مجھے پاپا کی ضرورت تھی تو ان کے پاس وقت نہیں تھا اور اب میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں ان کی آفر پر غور کروں" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارے پاس تو وقت ہی وقت ہے۔ ابھی تم کون سا جاب کر رہے ہو۔ کچھ بھی ہے' خالو کبھی تم سے غافل تو نہیں رہے" افزا نے کہا۔

"بے روزگاری کا طعنہ دے رہی ہو؟" فیضان نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں! میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں.... اچھا' تم مجھے بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟"

"اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" فیضان نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بات کا جواب دو' کتنی محبت کرتے ہو؟" وہ دوبارہ بولی۔

"ڈیئر! ابھی محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تو ضرور بتاتا۔"

"ارے' یہ تم دونوں کس بات پر الجھ رہے ہو؟ تمہیں کالج سے دیر نہیں ہو رہی؟" افزا کی امی نے کہا تو اسے بھی وقت کا احساس ہوا۔

وہ اپنی فائل اٹھاتے ہوئے بولی "میں جا رہی ہوں۔"

"فیضان تمہیں بائیک پر چھوڑ دے گا۔"

"نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

افزا اکیلی چلی گئی۔ اُس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔

وہ کہیں بھی جانے کا ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہ جانے کتنی دیر سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کالج سے آجائے تو اسے منا لے گا۔ آئس کریم اس کی کمزوری تھی اور پھر جب وہ اسے مناتا تھا تو تھوڑی دیر تنگ کر کے وہ مان بھی جاتی تھی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دھوپ آنگن سے رخصت ہو چکی تھی مگر افزا ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ امی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ فیضان اپنے کمرے میں بند تھا۔ صبح سے وہ گھر ہی میں تھا۔ گھنٹا بھر کے لیے باہر گیا تھا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کہ افزا کو منا کر آئس کریم کھلانے لے جائے گا مگر وہ نہ مانی تھی پھر وہ واپس آگیا تھا۔ تب سے وہ اپنے کمرے میں بند تھا۔

امی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج وہ کہاں رہ گئی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔ انہوں نے بے چینی سے فیضان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دوسری دستک پر اس نے دروازہ کھول دیا۔

"جی خالہ جان! کیا بات ہے' آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"وہ افزا ابھی تک نہیں آئی ہے۔"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا' کہاں رہ گئی وہ؟" اس کا دماغ ایک دم چکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے بس اسٹاپ پر کھڑا چھوڑ کر سیدھا گھر آیا تھا اور اسے آئے ہوئے پورے چھ گھنٹے گزر گئے تھے پھر افزا اب تک کیوں نہیں پہنچی تھی؟ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہوگی کیونکہ راستے میں وہ تھوڑی دیر کے لیے ایک دوست کے پاس رک گیا تھا۔ پھر گھر آکر بائیک کو لاک کر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ افزا آئی ہے کہ نہیں۔ وہ تو اپنے کمرے میں بند اس کی آمد کا منتظر تھا۔

اب وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے' کہاں ڈھونڈے؟ کہیں کسی نے اغوا تو نہیں کرلیا؟ آج کل یوں بھی ایسی وارداتیں عام ہوگئی تھیں' وہ لرز کر رہ گیا۔

"خالو آگئے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا' آتے ہی ہوں گے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ بغیر بتائے تو وہ کبھی بھی کہیں نہیں جاتی۔"

"آپ پریشان نہ ہو خالہ' میں دیکھتا ہوں" وہ یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈور بیل کی آواز پر چونک گیا۔

"لیجیے آگئی وہ" اس نے خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے گیٹ کھولا۔

سامنے دو پولیس والے کھڑے تھے۔ کالج یونیفارم میں ایک لڑکی گھبرائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔

"افزا کا گھر یہی ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی' یہی گھر ہے۔ کہاں ہے میری افزا؟" امی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آنٹی' افزا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے گھر تلاش کیا ہے۔"

یہ سنتے ہی امی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"آنٹی' ہمیں کیا پتا تھا کہ اس کا گھر اتنا نزدیک ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور ہی تو ایکسیڈنٹ ہوا تھا" لڑکی نے کہا۔

"فیضان کا دماغ چیخ کر رہ گیا۔ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

افزا کو بس اسٹاپ پر کھڑا چھوڑ کر وہ جیسے ہی چوراہے سے مڑا' سامنے سے آتے ہوئے اس کے دوست نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کی بھی نظر پڑ گئی تھی۔ دونوں گپ شپ میں لگ گئے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ گھر کی

طرف روانہ ہوگیا۔ گھر کے نزدیک ہی کچھ لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ پتا چلا تھا کہ کوئی لڑکی بس سے گر گئی ہے۔ فیضان نے آگے بڑھ کر سرسری سی نظر ڈالی تھی مگر بس سفید یونیفارم کی جھلک ہی نظر آئی تھی۔

نہ جانے کون ہے۔ وہ سوچتا ہوا واپس مڑ گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی!" کسی نسوانی آواز نے اسے مخاطب کیا تھا۔

وہ گھوما۔

ایک لڑکی اس سے مخاطب تھی۔ "پلیز! آپ ہی کچھ مدد کریں۔ اگر فوری طور پر طبی امداد نہ ملی تو..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے پُرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھئی' آپ خود بھی پریشان ہوں گی اور مجھے بھی خوار کریں گی۔ پھر میرے پاس گاڑی نہیں' بائیک ہے۔" وہ ٹکا سا جواب دے کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"پلیز' آپ لوگ جلدی چلیں۔ وقت بہت کم ہے۔ آپ کو پتا ہے' وہ زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

لڑکی کی آواز پر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔

اچانک لڑکی کو بھی یاد آگیا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں نے آپ سے بھی اپیل کی تھی مگر آپ بھی انہی لوگوں میں شامل ہوگئے تھے جو صرف تماشا دیکھنے کے لیے دو گھڑی رک جاتے ہیں مگر کسی انسانی زندگی کو بچانے کی کوشش نہیں کرتے۔"

فیضان کی خالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"خالہ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ افزا ہوگی" وہ رو دینے کو تھا۔

پھر وہ سب اس لڑکی اور پولیس کے ساتھ اسپتال پہنچے۔

راستے میں لڑکی نے بتایا کہ ایک گھنٹے تک افزا یونہی سڑک پر پڑی رہی۔ کسی نے اسے اسپتال پہنچانے میں میری مدد نہ کی۔ پھر میں اکیلی ہی ٹیکسی میں اسے لے کر اسپتال پہنچی تو پولیس نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ ڈرائیور دوسری بس کو اوورٹیک کرنا چاہتا تھا' اس چکر میں اتنا زبردست جھٹکا لگا کہ وہ چلتی بس میں سے گر گئی ہمارے معاشرے کے لوگ اندھے' گونگے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ بے حسی چھا گئی ہے اور اگر کوئی انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ کرنا چاہتا ہے تو اسے میری طرح خوار ہونا پڑتا ہے۔ دوپہر سے پولیس والوں نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ میرا پورا گھر پریشانی کی لپیٹ میں آگیا ہے مگر مجھے اس کا ملال نہیں ہے۔"

"بیٹی' تم کتنی ہمدرد اور پُرخلوص ہو" امی نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں آنٹی! یہ کوئی احسان نہیں ہے۔ ایک انسانی زندگی بچانے کے لیے ہر شخص کو ذمے داری کا ثبوت دینا چاہیے" اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ "آنٹی! اللہ تعالیٰ آپ کی بیٹی کو زندگی دے۔ میری محنت وصول ہوجائے گی۔ میں سرخ رو ہوجاؤں گی کہ میں نے ایک زندگی بچانے میں مدد کی۔"

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو یوں رواں تھے جیسے افزا اس کی قریبی عزیز ہو۔

فیضان نے نظریں چرالیں۔ وہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ہول رہا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اسپتال پہنچتے ہی وہ لوگ آئی سی یو کے دروازے کی طرف بڑھے۔
نرس نے ان لوگوں کو باہر ہی روک لیا "پلیز' اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مریضہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔"
پولیس الگ اپنی قانونی کارروائی کے لیے ٹہل رہی تھی کہ کب افزا کو ہوش آئے اور وہ بیان لے سکیں۔
وہ سب آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے دعا کر رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر باہر آیا تو فیضان تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔
"پلیز ڈاکٹر! مجھے ایک نظر دیکھ لینے دیں۔ افزا کیسی ہے؟"
ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہمیں افسوس ہے۔ ہم اسے بچانے میں ناکام رہے۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ فوری طور پر طبی امداد مل جاتی تو شاید زندگی بچ جاتی۔"
ڈاکٹر نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ تو پوری بات سنے بغیر ہی اندر داخل ہو گیا تھا۔ سفید چادر میں لپٹا اس کا بے جان وجود اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے سفید چہرے پر اتنی معصومیت تھی جیسے سو رہی ہو۔
"افزا' افزا! مجھے معاف کر دو۔ کاش اس وقت میں نے بے حسی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سڑک پر تم پڑی ہوئی تھیں اور تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ کاش... کاش' میں نے غور کرنے کی کوشش تو کی ہوتی۔"
اسی وقت دو نرسیں اندر داخل ہوئیں "سر! آپ باہر جائیں اور ڈیڈ باڈی لے جانے کا انتظام کریں۔"
یہ الفاظ پگھلا ہوا سیسہ بن کر اس کے کانوں میں پڑے۔
اسپتال میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ افزا کی امی بے ہوش ہو چکی تھیں۔
فیضان ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ "افزا' افزا! میں تمہارا قاتل ہوں۔ مجھے سزا دو۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔ کاش میں نے بے حسی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔ خالہ' مجھے پھانسی دلا دو۔ مجھے نہیں چاہیے یہ زندگی۔"
فیضان کی چیخ و پکار سے ہر آنکھ پرنم تھی اور اس کے المیے پر وہ اجنبی لڑکی بھی زار و قطار رو رہی تھی۔
کاش' ہم بے حسی کا مظاہرہ کرنا چھوڑ دیں۔ ایکسیڈنٹ سے زخمی ہونے والوں کو صرف تماشائی کی نظر سے نہ دیکھیں۔
کاش' ہمارے اندر انسانیت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

○☆○

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk